قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

اشاعت کا چوہترواں سال

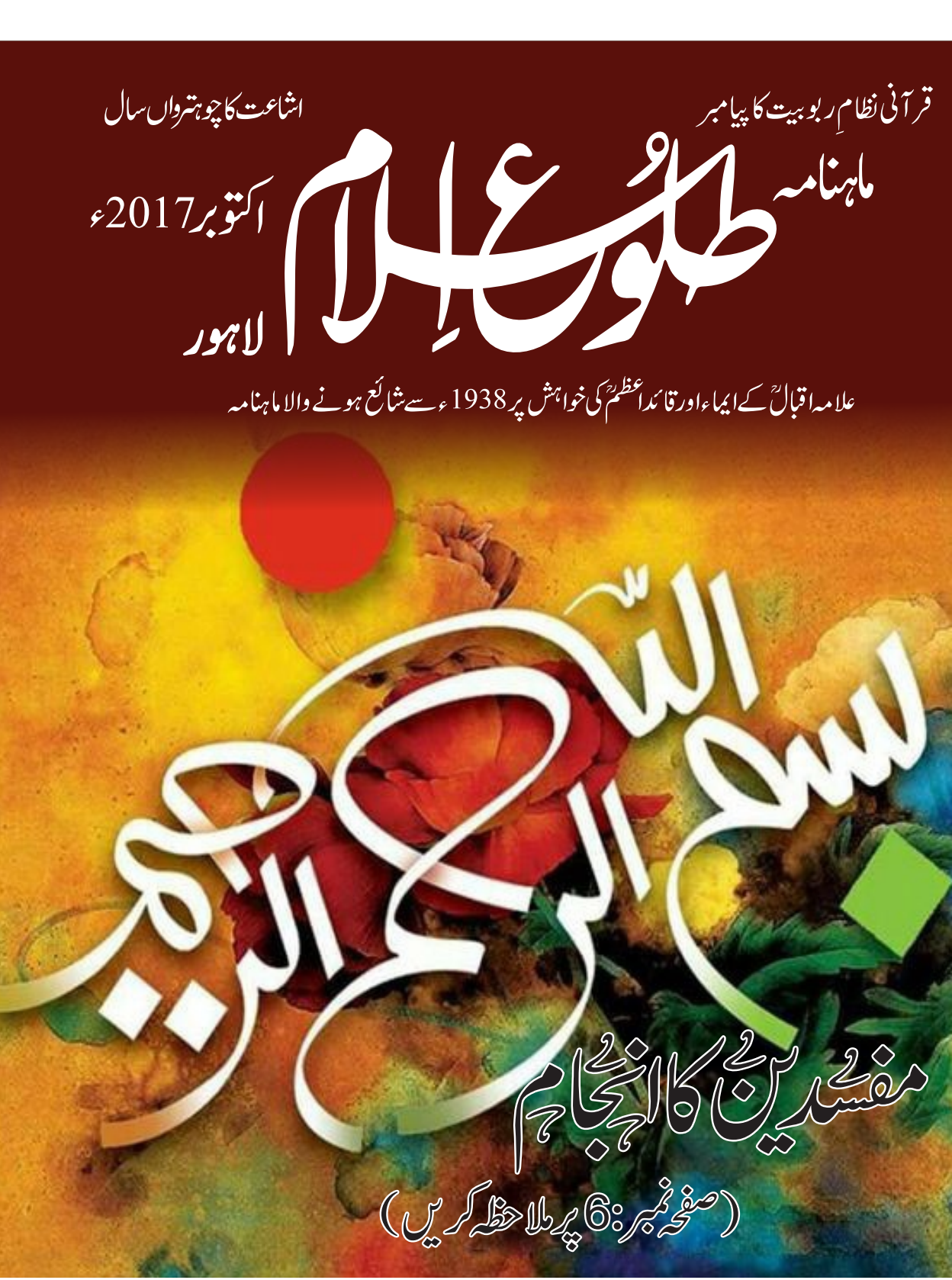
ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

اکتوبر 2017ء

علامہ اقبالؒ کے ایماء اور قائداعظمؒ کی خواہش پر 1938ء سے شائع ہونے والا ماہنامہ



مفسدین کا انجام

(صفحہ نمبر :6 پر ملاحظہ کریں)

رکوع وسجود وعبادت کا مقصد

جب ذہنِ انسانی اپنے عہد طفولیت میں تھا تو وہ (بچے کی طرح) محسوس اشیاء ہی کو سمجھتا تھا اور اپنے خیالات کا اظہار بھی محسوس طور پر کرتا تھا۔ آج کل کی علمی اصطلاح میں یوں کہئے کہ اس کا علم (Sense Perception) یعنی حواس کے دائرہ میں محدود تھا۔ وہ ہنوز تصورات (Concepts) کے ذریعے حصولِ علم یا اظہارِ خیالات کی منزل تک نہیں پہنچا تھا۔ یعنی وہ (Formalism) کی منزل میں تھا۔ اس نے ''خدا'' کے لئے محسوس پیکر تراش رکھے تھے۔ پوجا پاٹ کے طریق اور دیگر مذہبی رسوم و تقاریب میں بھی سارا زور شکل (Form) پر دیا جاتا اور اسے ہی مقصود بالذات سمجھا جاتا تھا۔

قرآن کریم نے اپنی تعلیم میں انسان کو عہد طفولیت سے نکال کر سن شعور اور بلوغت میں لا کر مخاطب کیا ہے۔ وہ علم بالحواس کے ساتھ تصوراتی علم پر بھی زور دیتا ہے اور دین کے معاملہ میں بھی شکل کی بجائے معنویت (مقصود ومفہوم) کی اہمیت کو نمایاں کرتا ہے لیکن وہ شکل کو بالکل ترک نہیں کرتا۔ عبادات میں رکوع وسجود میں انسان سچ مچ اپنا سر خدا کے سامنے جھکاتا ہے۔ جسم کی ان حرکات و سکنات کے پیچھے ایک فلسفہ کارفرما ہے جسے دورِ حاضر کی اصطلاح میں متوازیت (Parallelism) کہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے نفس (Mind) کے ارادے اور اس کے جسم کی حرکت میں گہرا تعلق ہوتا ہے اور یہ دونوں متوازی چلتے ہیں۔ اس لئے کہ انسان کو تصورات کی تعبیر کے لئے شکل (Form) کے بغیر نہ چارہ ہوتا ہے' نہ تسکین۔ بڑے سے بڑا تصوراتی مفکر بھی جب بات کرتا ہے تو اس کے ہاتھ' پاؤں' سر' آنکھ کی حرکات ناگزیر ہوتی ہیں۔ وہ ان محسوس اشارات کے بغیر اپنے خیالات اور جذبات کا اظہار کر ہی نہیں سکتا۔ (وہ اس طرح مجرد حقائق (Abstract Truths) کو بھی محسوس مثالوں سے سمجھاتا ہے) یہ وجہ ہے کہ قرآن کریم نے (Form) سے اس قدر بلند ہو جانے کے باوجود' بعض مقامات میں اسے باقی رکھا ہے۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ انسان کا اس طرح خدا کے سامنے سر جھکا دینا' اس کے اس جذبہ اور ارادہ کا محسوس مظاہرہ ہوگا کہ وہ قوانین خداوندی کے سامنے سر تسلیم خم کرتا ہے۔ یعنی وہ خدا کی کامل اطاعت کا عہد کرتا ہے۔ یہ ''محکومی'' درحقیقت' زندگی کی بلند' مستقل اقدار کو ازخود اپنے اوپر عائد کرنا ہوتا ہے۔ کسی کی خارج سے عائد کردہ پابندیاں نہیں ہوتیں۔ نہ ہی اس میں (Worship) کا وہ مفہوم ہوتا ہے جسے زمانہ قدیم کے انسان نے' فطرت کی قوتوں سے ڈر کر' انہیں خوش کرنے کے لئے' اپنے ذہن سے وضع کیا تھا۔ اگر انسان کا

بقیہ صفحہ نمبر 66 پر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

اکتوبر 2017ء

جلد 70 | شمارہ نمبر 10

اس شمارے میں

عنوان	مصنف	صفحہ نمبر
لمعات: طلوع اسلام یہ نہیں کہتا!	ادارہ	4
مفسدین کا انجام	غلام احمد پرویز	6
پرویز صاحب اور اُن کے نظریات کا تعارف	ملک منظور حسین لیل، بھکر	14
مکالمہ	شیخ اللہ دتا	22
ایک جید عالم دین کی خدمت میں چند گذارشات	خواجہ ازہر عباس، کراچی	30
بچوں کا صفحہ: نئے پڑوسی	ادارہ	38
نوعِ انسانی امتِ واحدہ۔۔۔ایک قرآنی تصور	ڈاکٹر محمد راحیل اکبر	40
دوقومی قرآنی نظریہ پر مطالبہ پاکستان	ڈاکٹر انعام الحق، اسلام آباد	46

ENGLISH SECTION

Chapter 7: Present Hell (Episode-2)
(*Qiyamat-e- Maujood* قیامت موجود)
By G. A. Parwez (Translated by: M. Alam) **54**

Working together: Some thoughts and reflections
Mansoor Alam **63**

ناشر و چیئرمین: محمد اکرم راٹھور

مجلسِ ادارت
ڈاکٹر انعام الحق، ڈاکٹر منظور الحق
خواجہ ازہر عباس

مدیر انتظامی: محمد سلیم اختر

قانونی مشیر: ملک محمد سلیم ایڈووکیٹ

ادارہ کا مضمون نگار کی تحریر سے کلّی اتفاق ضروری نہیں۔

زرِ تعاون: 50 روپے فی پرچہ
پاکستان: 550 روپے سالانہ
رجسٹرڈ ڈاک: 800 روپے سالانہ
بیرونِ ملک: 2500 روپے سالانہ
رجسٹرڈ ڈاک: 5000 روپے سالانہ

ادارہ طلوعِ اسلام 25-B گلبرگ 2، لاہور 54660، (پاکستان)
Phone: 042-35714546 , Cell: 0321-4460787
idarati@gmail.com
www.facebook.com/Talueislam

Bank Account Idara Tolu-e-Islam
National Bank of Pakistan, Main Market Branch Gulberg Lahore
For Domestic Transactions
Bank A/C No: 0465004073177672
For International Transactions
IBAN:PK36NBPA0465004073177672
Swift Code: NBPAPKKAA02L

ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صَرف کی جاتی ہے

اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز سے چھپوا کر 25-B، گلبرگ II لاہور سے شائع کیا

طلوعِ اسلام

خدائے لم یزل کا دست قدرت تو، زباں تو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے
پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جس کی گردِ راہ ہوں، وہ کارواں تو ہے
مکاں فانی، مکیں آنی، ازل تیرا، ابد تیرا
خدا کا آخری پیغام ہے تو، جاوداں تو ہے
حنا بندِ عروسِ لالہ ہے خونِ جگر تیرا
تری نسبت براہیمی ہے، معمارِ جہاں تو ہے
تری فطرت امیں ہے ممکناتِ زندگانی کی
جہاں کے جوہرِ مضمر کا گویا امتحاں تو ہے
جہانِ آب و گل سے عالم جاوید کی خاطر
نبوت ساتھ جس کو لے گئی وہ ارمغاں تو ہے
یہ نکتہ سرگزشتِ ملتِ بیضا سے ہے پیدا
کہ اقوامِ زمینِ ایشیا کا پاسباں تو ہے
سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

(بانگِ درا۔ علامہ اقبالؒ)

(جاری ہے)

ادارہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

لمعات

طلوعِ اسلام یہ نہیں کہتا!

اگر آپ نے اس سے پہلے نہ سنا ہو تو اب سن لیجئے کہ:

طلوعِ اسلام کبھی یہ نہیں کہتا کہ آپ مسلمانوں سے ہٹ کر کوئی نیا فرقہ بنائیں۔ کیونکہ قرآن کی رو سے فرقہ بندی شرک ہے۔

طلوعِ اسلام کبھی یہ نہیں کہتا کہ آپ پانچ نمازیں نہ پڑھئے تین پڑھیں۔ یا اس طرح نہ پڑھیں اس طرح پڑھیں۔

طلوعِ اسلام یہ کبھی نہیں کہتا کہ آپ مہینہ بھر کے روزے نہ رکھیں۔ نو دن کے رکھیں یا تین دن کے رکھیں۔

طلوعِ اسلام کبھی یہ نہیں کہتا کہ آپ حج نہ کریں۔

غرضیکہ طلوعِ اسلام کبھی یہ نہیں کہتا کہ آپ مسلمانوں جیسی زندگی بسر نہ کریں۔ طلوع اسلام فقط اتنا کہتا ہے کہ آپ جو کچھ کریں اس میں یہ دیکھ لیں کہ وہ اللہ کی منشاء (قرآنِ کریم) کے مطابق ہو رہا ہے یا نہیں؟ اس کا طریقہ یہ ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ اس عمل کا وہ نتیجہ نکل رہا ہے یا نہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام پاک میں بیان کیا ہے اگر وہ نتیجہ نکلتا ہے تو آپ کا عمل خدا کی منشاء کے مطابق ہے اور اگر نہیں نکلتا تو وہ خدا کی منشاء کے مطابق نہیں ہے۔

اللہ نے قرآن میں کہا ہے کہ دین پر عمل کرنے کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہیں اس دنیا کی خوشگواریاں نصیب ہو جائیں گی اور آخرت بھی سنور جائے گی۔ لہٰذا اگر ہمارے اعمال سے دنیا کی خوشگواریاں نہیں ملتیں۔ اگر لوگ بھوکے مرتے ہیں، کپڑا نصیب نہیں ہوتا۔ انہیں رہنے کو مکان نہیں ملتا انہیں بین الاقوامی دنیا میں عزت نصیب نہیں ہوتی تو ہمارے اعمال دین کے مطابق نہیں ہیں۔ انہیں دین کے مطابق کر لو تو تمہیں یہ سب کچھ مل جائے گا۔

طلوعِ اسلام بس اتنا کہتا ہے۔ جو شخص اس کے خلاف کوئی بات اس کی طرف منسوب کرتا ہے وہ فتنہ پھیلاتا ہے اور فساد برپا کرتا ہے۔

توجہ فرمائیے

اس امر کو واضح کر دینا ضروری ہے کہ ادارہ طلوع اسلام کا ملکی یا غیر ملکی کسی بھی سیاسی پارٹی یا فرقہ سے براہِ راست یا بالواسطہ کوئی تعلق نہیں ہے۔ نہ ہی ادارہ طلوع اسلام خود کوئی سیاسی پارٹی یا مذہبی فرقہ ہے۔ یہ صرف اور صرف ایک فکری اور علمی تحریک ہے۔

(چیئرمین ادارہ)

قرآن حکیم کے طالب علموں کے لیے خوشخبری

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے سات سو سے زائد دروسِ قرآنی پر مبنی تفسیری سلسلہ کے تحت بزم طلوع اسلام لاہور کی طرف سے مندرجہ ذیل تفسیری کتب کی اشاعت الگ الگ جلدوں میں ہو چکی ہے۔ یہ جلدیں 20x30/8 کے بڑے سائز کے بہترین کاغذ پر خوبصورت طباعت اور مضبوط جلد بندی کے ساتھ دستیاب ہیں۔ جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

مطالب القرآن فی دروس الفرقان

نام کتاب	سورہ نمبر	صفحات	نیا ہدیہ	نام کتاب	سورہ نمبر	صفحات	نیا ہدیہ
سورہ الفاتحہ	(1)	240	200/-	سورۃ المؤمنون	(23)	408	400/-
سورہ الفاتحہ (سٹوڈنٹ ایڈیشن)	(1)	240	110/-	سورۃ النور	(24)	264	350/-
سورۃ البقرہ (اول)	(2)	500	400/-	سورۃ الفرقان	(25)	389	350/-
سورۃ البقرہ (دوم)	(2)	538	400/-	سورۃ الشعرآء	(26)	454	400/-
سورۃ البقرہ (سوم)	(2)	500	400/-	سورۃ النمل	(27)	280	300/-
سورہ آل عمران (اول)	(3)	472	500/-	سورہ القصص	(28)	334	350/-
سورہ آل عمران (دوم)	(3)	480	500/-	سورہ عنکبوت	(29)	388	350/-
سورۃ النساء	(4)	870	700/-	سورہ روم، لقمان، السجدہ	(30,31,32)	444	400/-
سورۃ المائدہ	(5)	450	500/-	سورہ احزاب، سبا، فاطر	(33,34,35)	570	400/-
سورۃ الانعام	(6)	600	600/-	سورہ یٰسٓ	(36)	164	150/-
سورۃ انفال	(8)	210	250/-	سورہ الصّٰفّٰت، ص، زمر	(37,38,39)	450	400/-
سورہ توبہ	(9)	530	550/-	سورۃ مومن، حٰمٓ سجدہ، سورہ شوریٰ	(40,41,42)	624	550/-
سورۃ ھود	(11)	400	400/-	سورۃ زخرف، دخان، جاثیہ، احقاف، محمدؐ	(43-44-45 46-47)	520	500/-
سورۃ یوسف	(12)	288	300/-	سورۃ الفتح، الحجرات، ق، الذاریات، الطور، النجم	(48-49-50 51-52-53)	550	500/-
سورہ رعد، ابراہیم، الحجر	(13-15)	500	500/-	سورۃ القمر، الرحمٰن، واقعہ، الحدید	(54-55 56-57)	384	400/-
سورہ النحل	(16)	334	300/-	28 واں پارہ (مکمل) مجادلہ، حشر، ممتحنہ، صف، جمعہ، منافقون، تغابن، طلاق، تحریم	(58-59-60-61-62-63-64-65-66)	300	300/-
سورہ بنی اسرائیل	(17)	396	----				
سورۃ الکہف و سورہ مریم	(18-19)	532	----	29واں پارہ (مکمل)	----	544	400/-
سورہ طٰہٰ	(20)	416	350/-	30واں پارہ (مکمل)	----	624	400/-
سورۃ الانبیآء	(21)	336	300/-	شرح جاوید نامہ	----	800	1000/-
سورۃ الحج	(22)	380	350/-				

ادارہ طلوعِ اسلام B-25 گلبرگ 2، لاہور 54660، (پاکستان) فون نمبر: +92 42 3571 4546 +92 321 4460 787

بزم ہائے طلوع اسلام اور تاجر حضرات کو ان ہدیوں پر تاجرانہ رعایت دی جائے گی۔ ڈاک خرچ اس کے علاوہ ہوگا۔

غلام احمد پرویزؒ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مفسدین کا انجام

حذر اے چیرہ دستاں! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

اصلاح اور فساد، قرآن کریم کی دو اہم اصطلاحات ہیں اور ایک دوسرے کی ضد۔ ہمارے ہاں، فساد کا لفظ، دنگہ فساد یا لڑائی جھگڑے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور ''صلح'' کا لفظ ''صلح صفائی'' کے لئے اور اصلاح' ریفارم کے معنوں میں۔ لیکن (عربی زبان اور) قرآن کریم میں یہ اصطلاحات' ان سے کہیں زیادہ وسیع معانی میں استعمال ہوئی ہیں۔ صلح کے بنیادی معنی ہوتے ہیں ''جس چیز کو جس حال میں ہونا چاہئے' اس کا ٹھیک ٹھیک اسی حال میں ہونا''۔ چنانچہ معاشرہ کی ناہمواریاں دور ہو جانے اور افراد کی صلاحیتوں کے مناسب نشوونما پا لینے کے لئے بھی یہی الفاظ آتے ہیں۔ اعمال صالحہ' ان کاموں کو کہتے ہیں جن سے حسن کائنات میں نکھار پیدا ہو' جن سے معاشرہ کے بگڑے ہوئے کام سنور جائیں۔ اور انسانی ذات کی صلاحیتوں کی نشوونما ہو جائے۔ فساد اس کی ضد ہے جس کے معنی ہیں' بگاڑ پیدا ہونا۔ توازن بگڑنا۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس بات کے پرکھنے کا معیار کیا ہے کہ ایک چیز کو جس حالت میں ہونا چاہئے وہ اس حالت میں ہے یا نہیں۔ طبیعی اشیاء (Physical Things) کے متعلق یہ معلوم (یا طے) کرنا آسان ہے کہ جس شئے کو جس حالت میں ہونا چاہئے وہ اس حالت میں ہے یا نہیں۔ معمل (یعنی لیبارٹری) کا ٹسٹ' اس کا فیصلہ کر دیتا ہے۔ لیکن انسانوں کی اخلاقی اور تمدنی دنیا میں اس کا فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس دنیا میں کوئی مفسد' اس کا اقرار و اعتراف نہیں کرتا کہ وہ فساد پیدا کر رہا ہے۔ اس کا دعویٰ یہی ہوتا ہے کہ وہ مصلح (اصلاح کرنے والا ہے) چنانچہ قرآن کریم میں ہے کہ:

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ ۙ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ۝ (2:11)

جب ان سے کہا جاتا ہے کہ ملک میں فساد مت برپا کرو تو یہ کہتے ہیں کہ (ہم فساد کب برپا کرتے ہیں) ہم تو مصلح ہیں۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک شخص بدنیتی سے فساد کو اصلاح سے تعبیر نہ کرتا ہو بلکہ نہایت نیک نیتی سے فساد کو اصلاح سمجھ کر اس کے لئے کوشاں ہو۔ لیکن نتیجہ بہرحال دونوں صورتوں میں ایک ہی مرتب ہوگا۔۔۔ لہٰذا' اس چیز کو لوگوں کے انفرادی فیصلے پر نہیں چھوڑا جا سکتا۔ اس کے لئے کوئی خارجی معیار (Objective Standard) ہونا چاہئے۔ اس کے لئے قرآن کریم نے' حسب معمول' ہماری توجہ خارجی کائنات کے نظم و نسق کی طرف مبذول کرائی ہے اور کہا ہے' کہ تم دیکھتے ہو کہ کارگہ کائنات کس طرح ٹھیک ٹھیک چل رہا ہے۔ اس میں ہر شے ویسی ہی ہوتی ہے جیسی اسے ہونا چاہئے۔ یہ کبھی نہیں ہوتا کہ آج بارش

کے پانی کے اجزاء کچھ اور ہوں اور کل وہ کچھ اور ہو جائیں۔ ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ جو کے بیج سے گندم پیدا ہو جائے اور گندم کے بیج سے جو۔۔ سورج کبھی کہیں سے طلوع ہونا شروع ہو جائے اور کبھی کہیں سے' چاندنی کا رنگ آج کچھ اور ہو اور کل کچھ اور' کبھی خزاں میں پھول کھلنے لگ جائیں اور بہار میں مرجھا جائیں۔۔ ایسا کیوں ہے؟ اس لئے کہ:

(1) کائنات میں۔۔ صرف ایک خدا کا قانون نافذ العمل ہے' کسی اور کا نہیں۔۔ اس لئے یکساں حالات میں ہر عمل کا نتیجہ بھی ایک جیسا مرتب ہوتا ہے۔ اسے سائنس کی اصطلاح میں (Law of Uniformity of Nature) کہتے ہیں۔۔ اور

(2) ہر شے اس قانون کے مطابق زندگی بسر کرتی ہے جو اس کے لئے تجویز کیا گیا ہے۔ وہ قانون کو اپنی مرضی کے تابع نہیں رکھتی۔

اوّل الذکر کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ: لَوْ كَانَ فِيهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ۚ (21:22)

اگر ارض وسما (کائنات) میں خدا کے علاوہ کوئی اور صاحب اقتدار بھی ہوتا تو اس میں فساد برپا ہو جاتا۔

اور ثانی الذکر کے سلسلہ میں کہا کہ:

وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيهِنَّ ط (23:71)

اگر حق (خدا کا قانون محکم) لوگوں کی مرضی کے تابع ہو جائے' تو ساری کائنات میں فساد برپا ہو جائے۔

یعنی فساد (بگاڑ) سے بچنے کے لئے ضروری ہے کہ:

(1) قانون ایسا ہو جو کسی کی خواہش' مرضی' آرزو' یا مفاد کے تابع نہ ہو۔۔ اور

(2) ہر ایک اس قانون کا اتباع کرے۔ خارجی کائنات کا نظام اسی پروگرام کے مطابق چل رہا ہے۔ اس میں جو قانون کارفرما ہے وہ نہ تو اشیائے کائنات کا اپنا پیدا کردہ ہے اور نہ ہی کسی کی خواہش کے مطابق اس میں تبدیلی ہو سکتی ہے اور دوسرے یہ کہ ہر شے اس قانون کے مطابق چلنے پر مجبور ہے۔ وَمَنْ عِنْدَهٗ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ (21:19)

جہاں تک انسانوں کی تمدنی دنیا کا تعلق ہے' اس کے لئے بھی اسی خدا نے قوانین مقرر کر دیئے ہیں جس نے اشیائے کائنات کے لئے قوانین مرتب کئے ہیں۔ لیکن انسان اور دیگر اشیائے کائنات میں ایک بنیادی فرق ہے (جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے) اشیائے کائنات' متعلقہ قوانین کے مطابق زندگی بسر کرنے پر مجبور پیدا کی گئی ہیں' لیکن انسان کو اس باب میں صاحب اختیار وارادہ بنایا گیا ہے۔ مشیت چاہتی یہ ہے کہ جو کچھ اشیائے کائنات مجبوراً کرتی ہیں' انسان وہی کچھ (یعنی قوانین خداوندی کا اتباع) اپنے اختیار وارادے سے کرے' کہ اسی سے اس کی ذات کی نشوونما اور شرف انسانیت کی بالیدگی ہوتی ہے۔

لیکن انسان اپنے اختیار وارادے کا استعمال غلط کرتا ہے اور اسی سے وہ تمام فساد پیدا ہوتا ہے' جو اس کی زندگی کو جہنم بنا دیتا ہے۔ یہ اپنے لئے آپ قوانین وضع کرتا ہے اور پھر تماشا یہ کہ ان قوانین کا بھی کما حقہٗ اتباع نہیں کرتا۔ ان سے بچنے کے لئے گریز کی ہزار راہیں نکالتا اور لاکھ حربے تراشتا ہے۔۔ انسان کی یہی وہ ذہنیت (اور روش) ہے' جسے قرآن کریم نے قصہ آدم کے تمثیلی انداز میں بایں حسن وخوبی بیان کیا ہے۔ ملائکہ اس جدید مخلوق کے ہیولائے آب وگل کو دیکھ کر کہتے ہیں کہ

اَتَجۡعَلُ فِیۡہَا مَنۡ یُّفۡسِدُ فِیۡہَا وَیَسۡفِکُ الدِّمَآءَ ۚ (2:30) اسے بااختیار بنایا جارہا ہے؟ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ زمین میں فساد برپا کرے گا اور خون بہائے گا۔۔ کہا کہ ٹھیک ہے۔ اگر اسے اعلیٰ حالہٖ چھوڑ دیا گیا تو یہ ایسا ہی کرے گا۔ لیکن ہم اسے خود قوانین زندگی دیں گے۔۔ (فَاِمَّا یَاۡتِیَنَّکُمۡ مِّنِّیۡ ہُدًی) یہ اگر ان قوانین کا اتباع کرے گا تو پھر یہ حالت نہیں ہوگی۔۔ فَمَنۡ تَبِعَ ہُدَایَ فَلَا خَوۡفٌ عَلَیۡہِمۡ وَلَا ہُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ ﴿۳۸﴾ (2:38) جو ان قوانین کا اتباع کرے گا تو ایسے لوگوں کو نہ خوف ہوگا نہ حزن' ان کی تمدنی زندگی فساد انگیزیوں سے مامون اور خون ریزیوں سے مصئون رہے گی۔ اس کا نام اصلاح ہے اور اس کی خلاف ورزی کا نتیجہ فساد۔۔ اسی لئے تاکید کی گئی کہ: وَلَا تُفۡسِدُوۡا فِی الۡاَرۡضِ بَعۡدَ اِصۡلَاحِہَا جب تمہاری تمدنی زندگی بہ حالت اصلاح ہو تو اس میں فساد مت پیدا کرو اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ: وَادۡعُوۡہُ خَوۡفًا وَّطَمَعًا ؕ (7:56) رفع مضرت مقصود ہو' یا جلب منفعت (کسی کے نقصان سے بچنا چاہو' یا کوئی فائدہ حاصل کرنا۔ دونوں صورتوں میں) قانون خداوندی کو آواز دیا کرو' اور اس کے مطابق قدم اٹھایا کرو۔ تمہاری زندگی فساد سے محفوظ ہو جائے گی۔ اس کے برعکس اگر تم نے اس اصول حیات سے انکار کیا اور اس سے سرکشی برتی۔۔ خود بھی سرکشی برتی اور دوسروں کو بھی اس راستے پر چلنے سے روکا' تو اس سے اس قسم کا فساد پیدا ہو جائے گا جس کی تباہیاں بڑھتی چلی جائیں گی۔ (16:87)

ان اصولی ہدایات کے بعد قرآن کریم نے محسوس انداز میں بتایا کہ انسانوں کی تمدنی زندگی میں فساد کس کس شکل میں رونما ہوتا ہے۔ سب سے پہلے اس نے فساد ملوکیت کو نمایاں طور پر پیش کیا جس کی نمائندگی دنیا کا ہر فرعون کرتا ہے۔ ملوکیت سے مراد ہے ایسا نظام مملکت جس میں انسانوں کے خود ساختہ قوانین کی اطاعت کی جائے (خواہ اس کی عملی شکل'۔۔۔ جلال پادشاہی ہو' یا جمہوری تماشا)۔ مفاد ملوکیت کا پہلا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ انسانی وحدت کو ختم کر کے' انہیں مختلف گروہوں میں بانٹ دیا جائے۔ وَیَقۡطَعُوۡنَ مَاۤ اَمَرَ اللّٰہُ بِہٖۤ اَنۡ یُّوۡصَلَ وَیُفۡسِدُوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ ۙ (13:25) جس انسانی برادری کو ملا کر رکھنے کا حکم خدا نے دیا تھا وہ اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے ہیں اور اس طرح زمین میں فساد برپا کر دیتے ہیں۔۔ اس کی بدترین شکل' عصر حاضر کی قومیت پرستی (نیشنلزم) ہے جس نے (محض نقشوں پر کھینچی ہوئی فرضی اور غیر فطری لکیروں کے مطابق) عالمگیر انسانیت کو اس طرح مختلف گروہوں میں بانٹ رکھا ہے کہ ایک گروہ' دوسرے گروہ کے خون کا پیاسا' اور ایک قوم دوسری قوم کی جان کی دشمن بن رہی ہے۔ اس سے اگلا قدم' ایک قوم کے اندر مختلف پارٹیاں بنانا ہے۔ قرآن کریم نے فرعون کے خلاف جو سب سے بڑا جرم عائد کیا ہے' وہ یہی ہے کہ وہ قوم (بنی اسرائیل) کو پارٹیوں میں تقسیم کرتا رہتا تھا۔۔ اِنَّ فِرۡعَوۡنَ عَلَا فِی الۡاَرۡضِ (28:4) فرعون نے ملک میں بڑی سرکشی اختیار کر رکھی تھی۔۔ اس نے ادھم مچا رکھا تھا وَجَعَلَ اَہۡلَہَا شِیَعًا (28:4) یعنی اس نے ملک کے باشندوں کو مختلف پارٹیوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔۔ اس پارٹی بازی سے اس کا مقصد کیا تھا؟ یہ کہ یَّسۡتَضۡعِفُ طَآئِفَۃً مِّنۡہُمۡ (28:4) وہ اس طرح اس گروہ کو جس سے اسے ذرا خطرہ محسوس ہوتا تھا' کمزور کر دیتا تھا۔

اس کی عملی شکل یہ تھی کہ یُذَبِّحُ اَبْنَآءَهُمْ وَيَسْتَحْيٖ نِسَآءَهُمْ ؕ (28:4) اس پارٹی کے ان افراد کو جن میں جوہر مردانگی کی نمود ہوتی، ذلیل وخوار کر دیتا اور ''زنخوں'' کو آگے بڑھاتا چلا جاتا۔ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ ۝ (28:4) یہ تھی اس کی فساد انگیزی، جس سے اس نے معاشرہ میں اس قدر ناہمواریاں پیدا کر رکھیں تھیں۔

اور یہ چیز کسی خاص فرعونی حاکم کے ساتھ مخصوص نہیں تھی، یہ ملوکانہ حکمت عملی ہے، جو ہر زمانے میں اسی طرح کارفرما رہتی ہے۔ چنانچہ سورہ نمل میں، اس حقیقت کو (ملکہ سبا کی زبانی) ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ

اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً ۚ وَكَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ ۝ (27:34)

یاد رکھو! جب بادشاہ کسی ملک پر چڑھائی کرتے ہیں تو اسے الٹ پلٹ کر رکھ دیتے ہیں۔ یعنی وہاں کے صاحب عزت اکابرین کو سب سے زیادہ ذلیل وخوار بنا دیتے ہیں اور یہ بات کسی خاص بادشاہ سے متعلق نہیں، ملوکیت میں یہی کچھ ہوتا چلا آیا ہے اور یہی کچھ ہوتا رہے گا۔

ملوکیت کی ہستی کا راز ہی اس میں ہے کہ قوم مختلف پارٹیوں میں بٹی رہے، اور اس میں ایسا اتار چڑھاؤ ہوتا رہے کہ کبھی ایک گروہ اوپر آ جائے اور کبھی دوسرا۔ اور اس عمل دولابی میں نکتہ یہ پیش نظر رہے کہ جس فرد یا گروہ میں کہیں جوہر انسانیت کے آثار محسوس ہوں، اسے کچل کر رکھ دیا جائے اور اپنے گرد وپیش انہیں رکھا جائے جن میں ابھرنے کی صلاحیت ہی نہ ہو۔ یہ تھی فساد آدمیت کی وہ اولین لعنت جسے مٹانے کے لئے آسمانی انقلاب کے داعی (حضرات انبیاء کرامؑ) دنیا میں آتے رہے۔۔۔ اور یہی تھی ان کی وہ انقلابی دعوت، جسے ملوکیت کے علمبردار ''فساد'' سے تعبیر کر کے، کچل دینا چاہتے تھے۔ چنانچہ جب صاحبِ ضربِ کلیم، حضرت موسیٰؑ نے اس حکمت فرعونی کے خلاف آواز بلند کی تو فرعون کے درباریوں نے اس سے کہا کہ: اَتَذَرُ مُوْسٰى وَقَوْمَهٗ لِيُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ (7:127)۔ ''کیا تو موسیٰؑ اور اس کی قوم کو اس طرح آزاد چھوڑ دینا چاہتا ہے کہ وہ ملک میں فساد برپا کر دیں۔''

آپ نے غور فرمایا۔ کہ ملوکیت کے نمائندگان کے نزدیک ''اصلاح'' کا تصور کیا ہوتا ہے اور ''فساد'' سے مراد کیا؟ ہر مستبد قوت، معاشرہ میں صحیح اصلاح کو فساد سے تعبیر کر کے، اس کے داعیان کو حوالہ دار ورسن کر دینا چاہتی ہے۔ یہ ارباب اقتدار کا گروہ ہوتا ہے، جسے اس قسم کے صحیح انقلاب میں، اپنی مفاد پرستیوں کی موت نظر آتی ہے۔ قرآن کریم میں ہے کہ جب حضرت صالحؑ نے، قوم ثمود کی فساد انگیزیوں کے خلاف، (جن کی تفصیل ذرا آگے چل کر آئے گی) اعلان احتجاج کیا تو اس قوم کے ارباب اقتدار کو خطرہ محسوس ہوا۔ ان کی تعداد کچھ زیادہ نہیں تھی۔

وَكَانَ فِي الْمَدِيْنَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُّفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ ۝ (48:27)

دارالسلطنت میں صرف نو بڑے بڑے سردار تھے، جن کے ہاتھ میں زمام اقتدار تھی۔ وہی ان تمام شرارتوں کی جڑ تھے وہ ملک میں ناہمواریاں پیدا کرتے رہتے تھے اور قوم کو کبھی اصلاح کی طرف نہیں آنے دیتے تھے۔

چنانچہ انہوں نے اپنی میٹنگ بلائی اور آپس میں کہا کہ قسم اٹھاؤ کہ ہم سب مل کر صالحؑ اور اس کے ساتھیوں پر رات کے وقت حملہ کریں گے اور پھر ان کے ورثاء کے سامنے صاف مکر جائیں گے اور کہہ دیں گے کہ ہم نے انہیں قتل ہوتے دیکھا تک نہیں اور ہم بالکل سچ کہتے ہیں۔(27:49)

☆☆☆☆☆☆☆

یہ تھی فسادِ آدمیت کی پہلی شکل۔۔۔۔یعنی بساطِ ملوکیت کی مہرہ بازیاں۔۔اس کی دوسری شکل' معاشی ناہمواریاں ہیں جن کا ذکر قرآن کریم نے بڑی شرح وبسط سے کیا ہے۔اس نے قصہ آدم کے (تمثیلی انداز) میں' اس ''جنت کی زندگی'' کے متعلق' جس میں ہنوز فساد پیدا نہیں ہوا تھا' کہا کہ اس میں کیفیت یہ تھی کہ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا۔(2:35) ہر ایک کو' ہر جگہ' سیر ہو کر کھانے کو ملتا تھا۔۔اس میں کسی فرد کو' نہ بھوک کا خوف ستاتا تھا' نہ پیاس کا'۔۔نہ لباس کی محتاجی تھی نہ مکان کی'' (20:118-119) یہ تھی معاشرہ کی وہ حالت جسے فساد نے نہیں چھوا تھا۔اس کے بعد' حقیقت فراموش انسان کی مفاد پرستی نے اس میں فساد پیدا کر دیا تو معاشرہ کی یہ حالت باقی نہ رہی۔مصلحین انسانیت' حضرات انبیاء کرامؑ آتے رہے' تاکہ معاشرہ کو پھر سے انہی خطوط پر متشکل کریں۔وہ قوم سے کہتے یہ تھے کہ:

كُلُوا وَاشْرَبُوا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ۝(60:2)

خدا نے جس قدر سامانِ زیست عطا کیا ہے' اس میں سے اپنی اپنی ضرورت کے مطابق کھاؤ پیو۔اور زمین میں فساد آمت بر پا کرو۔۔معاشرہ میں ناہمواریاں نہ پیدا کرو۔

قرآن کریم نے جن اقوام کی سرگذشت بیان کی ہے' ان میں سے' قوم ثمودؑ نے اسی قسم کی معاشی ناہمواریاں شدید طور پر پیدا کر لی تھیں۔اس زمانے کی معیشت' گلہ بانی پر مبنی تھی۔قوم کے ذی قوت طبقہ نے' ملک کی چراگاہوں اور چشموں پر اس طرح قبضہ کر رکھا تھا کہ کمزوروں اور غریبوں کے مویشیوں کو نہ کھانے کو چارہ ملتا تھا' نہ پینے کو پانی۔۔حضرت صالحؑ اس ''فساد'' میں ''اصلاح'' پیدا کرنے کے لئے اٹھے۔انہوں نے ان مستبد سرداروں سے کہا کہ فَاذْكُرُوْٓا اٰلَآءَ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ۝(7:74) خدا نے تمہیں جن نعماء سے نوازا ہے' انہیں پیش نظر رکھو' اور ملک میں فساد بر پا نہ کرو۔۔معاشی ہمواریاں پیدا کرو اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ تمام مویشیوں کی باری باندھ لو۔۔خواہ وہ غریبوں کے مویشی ہوں اور خواہ امیروں کے' رزق کی ضرورت تو ہر مویشی کو ہوتی ہے۔ان کی ضروریات پوری ہونے دو۔

قوم مدین کا معاشی نظام' کاروباری تھا اور انہوں نے اس میں بھی فساد پیدا کر رکھا تھا۔اس فساد کی تشریح' حضرت شعیبؑ کے الفاظ میں یوں بیان ہوئی ہے۔انہوں نے قوم سے کہا کہ:

فَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا ط (85:7)

(تمہیں چاہئے' کہ اپنے معاشی نظام میں عدل سے کام لو) ماپ تول کو پورا رکھو۔ لوگوں کے حقوق و واجبات میں کمی نہ کرو' اور معاشرہ میں ہمواریاں پیدا ہو جانے کے بعد' ناہمواریاں مت پیدا کرو۔

قرآن کریم نے مختلف مقامات پر' قوم مدین کی اس فساد انگیزی کا ذکر کیا ہے اور ہر مقام پر اسے انہی الفاظ سے تعبیر کیا ہے (مثلاً 11:85، 185-62:184) ''ماپ تول پورا رکھنے'' سے مراد اتنا ہی نہیں کہ ترازو اور باٹ صحیح صحیح رکھو۔ اس سے مقصد یہ ہے کہ اپنے معاشی نظام کو عدل کی بنیادوں پر استوار کرو۔

معاشی فساد کی بنیاد سرمایہ دارانہ ذہنیت ہے۔ قرآن کریم نے قارون کو اس ذہنیت کے نمائندہ کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ سورہ قصص میں اس کی ''فساد انگیزی'' کی تفصیل ان الفاظ میں آئی ہے۔

قارون' قوم موسیٰؑ ہی کا ایک فرد تھا' کوئی غیر نہیں تھا۔ لیکن اپنی دولت کے بل بوتے پر اپنی قوم کے افراد سے بڑی زیادتی کرتا تھا۔ چنانچہ اس طرح اس کے پاس اس قدر دولت جمع ہو گئی' کہ اس کے خزانے کی حفاظت کے لئے ایک طاقتور جماعت کی ضرورت تھی۔ اس دولت کے نشہ نے اسے مدہوش کر دیا تھا۔ چنانچہ اس کی قوم کے ہوشمند طبقہ نے اس سے کہا کہ تم اس مال و دولت پر اس قدر اترا ؤ نہیں' اس کا نتیجہ خراب ہوگا۔ یہ روش' قانون خداوندی کی رو سے پسندیدہ نہیں۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ تم مال و دولت کو تیاگ کر تارک الدنیا بن جاؤ۔ ہرگز نہیں۔ ہم کہتے یہ ہیں کہ تم اس سے بھی فائدہ اٹھاؤ۔ لیکن اس حقیقت کو فراموش مت کرو کہ زندگی صرف اسی دنیا کی زندگی نہیں جس میں انسان کا منتہائے نگاہ مال و دولت جمع کرنا ہے اور بس! زندگی اس سے آگے بھی چلتی ہے۔ اس مال و دولت سے تم اس زندگی کو بھی خوشگوار بناؤ۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ جس طرح خدا نے تمہاری ہر کمی کو پورا کر کے تمہاری زندگی کو حسین بنا دیا ہے' اسی طرح تم دوسروں کی کمی کو پورا کر کے ان کی زندگی کو بھی حسین بنا دو۔ اور معاشرہ میں فساد (ناہمواریاں) مت پیدا کرو (کہ تم امیر سے امیر تر ہوتے جاؤ' اور دوسرے لوگ غریب سے غریب تر ہوتے جائیں۔ اسی کو فساد کہتے ہیں) اور فساد پیدا کرنے والوں کو خدا کبھی پسند نہیں کرتا۔

یہ سن کر اس نے ان سے کہا کہ تمہیں میرے معاملات میں دخل دینے کا کیا حق ہے۔ یہ دولت میں نے اپنی ہنرمندی اور چابک دستی سے کمائی ہے' اس لئے جس طرح میرا جی چاہے' صرف کروں۔ اس میں خدا کا کیا دخل ہے اور کسی کو مجھ سے باز پرس کرنے کا کیا حق حاصل ہے؟

اے کاش! اسے معلوم ہوتا کہ اس قسم کی ذہنیت نے اس سے پہلے کتنی قوموں کو تباہ کر دیا تھا جو اس سے زیادہ قوت و حشمت کی مالک تھیں' اور انہوں نے مال و دولت بھی اس سے کہیں زیادہ جمع کر رکھا تھا۔ خدا کے قانون مکافات نے انہیں تباہ کر دیا۔ ان کے یہ جرائم اس قدر بدیہی اور نمایاں تھے کہ اس کی بھی ضرورت نہ پڑی کہ ان کے متعلق کچھ پوچھ گچھ کی جائے۔ (نظام سرمایہ داری کی تو بنیاد میں خرابی کی صورت مضمر ہوتی ہے۔ اس لئے اس کی تباہی کہیں خارج سے نہیں آیا کرتی۔)

(مفہوم القرآن 70-28:76)

اور فساد کا یہی تباہ کن انجام ہے جس کی طرف قرآن کریم نے بار بار توجہ دلائی ہے۔۔ کہیں عمومی حیثیت سے' اور کہیں فساد انگیز قوموں کی تباہی کا خصوصی ذکر کر کے۔۔ عمومی طور پر کہا کہ:

اَلَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا وَصَدُّوۡا عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ زِدۡنٰہُمۡ عَذَابًا فَوۡقَ الۡعَذَابِ بِمَا کَانُوۡا یُفۡسِدُوۡنَ ﴿۸۸﴾ (16:88)

جو لوگ اس صداقت سے خود بھی انکار کرتے ہیں اور دوسرے لوگوں کو بھی اس طرف آنے نہیں دیتے' ان کی تباہیاں دن بدن بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ یہ اس فساد کا فطری نتیجہ ہوتا ہے۔ جسے وہ معاشرہ میں برپا کرتے ہیں۔

سورہ بقرہ میں' اس روش کے حاملین کا ذکر کرنے کے بعد کہا کہ: اُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡخٰسِرُوۡنَ ﴿۲۷﴾ (2:27)

ان لوگوں کا انجام تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔ سورہ یونس میں کہا کہ: اِنَّ اللّٰہَ لَا یُصۡلِحُ عَمَلَ الۡمُفۡسِدِیۡنَ ﴿۸۱﴾ (10:81) یہ یقینی بات ہے کہ خدا کے قانون مکافات کی رو سے' ایسا ہو نہیں سکتا' کہ معاشرہ میں فساد پیدا کرنے والوں کے کام سنور جائیں۔ یعنی معاشرہ میں بگاڑ پیدا ہو جائے اور جو لوگ اس بگاڑ کے ذمہ دار ہوں' ان کی حالت سنورتی جائے' یہ ناممکن ہے۔ حالت انہی کی سنورے گی جو معاشرہ کو سنوارنے کی کوشش کریں گے۔ سورہ ص میں ہے۔

اَمۡ نَجۡعَلُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کَالۡمُفۡسِدِیۡنَ فِی الۡاَرۡضِ (28:38)

کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ وہ لوگ جو قوانین خداوندی کی صداقت پر یقین رکھیں اور معاشرہ کو سنوارنے والے کام کریں' وہ اور وہ لوگ جو معاشرہ میں فساد پیدا کریں' دونوں برابر ہو جائیں؟ ایسا ہو نہیں سکتا۔

اس اصول محکم کی تبیین کے لئے اس نے کہا کہ تاریخ کے اوراق پر غور کرو اور دیکھو کہ جن اقوام نے اس قسم کی روش اختیار کی تھی' ان کا انجام کیا ہوا؟ وَانۡظُرُوۡا کَیۡفَ کَانَ عَاقِبَۃُ الۡمُفۡسِدِیۡنَ ﴿۸۶﴾ (7:86) عاد اور ثمود اور فرعون (وغیرہ) نے معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا کیں فَصَبَّ عَلَیۡہِمۡ رَبُّکَ سَوۡطَ عَذَابٍ ﴿۱۳﴾ (89:13) تو خدا کے قانون مکافات نے انہیں بری طرح سے تباہ کر دیا۔

یہ تباہی اس وقت آتی ہے جب معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا کرنے کی روش عام ہو جائے اور جو لوگ اس پوزیشن میں ہوں کہ اس غلط روش کا سدباب کر سکیں وہ بھی لوگوں کو اس سے روکنے کی کوشش نہ کریں۔۔ چنانچہ اقوام سابقہ کی سرگزشت بیان کرنے کے بعد' قرآن کریم نے کہا کہ ان اقوام میں سے جو لوگ تباہی سے بچ جاتے تھے' ان میں سے بھی بعد میں' معدودے چند ایسے رہ جاتے جو اپنے مفاد کو خدا کے قانون کے مطابق حاصل کرنے کی کوشش کرتے اور ملک میں لوگوں کو ناہمواریاں پیدا کرنے سے روکتے' ورنہ باقیوں کا حال تو یہ ہو جاتا کہ وہ قوانین خداوندی سے سرکشی برت کر' اپنی اپنی مفاد پرستیوں کے پیچھے لگے رہتے اور دوسروں کا سب کچھ لوٹ کھسوٹ کر لے جاتے' تاکہ ان کی آسودگیوں اور تن آسانیوں میں فرق نہ آنے پائے (خواہ باقی مخلوق پر کچھ ہی کیوں نہ گزر رہے' یہ تھے ان کے جرائم جن کی وجہ سے ان پر تباہی آتی تھی۔ (مفہوم القرآن، 11:116)

آپ قرآن کریم کے ان مقامات پر غور کریں اور پھر سوچیں کہ اس نے فساد آدمیت کی جو جو شقیں بتائی ہیں' کیا وہ ہمارے معاشرے میں جمع نہیں ہو رہیں؟ اور اگر یہ حقیقت ہے تو کیا اس انداز معاشرت کا حتمی اور یقینی نتیجہ وہی نہیں ہوگا۔ جو اقوام سابقہ کے ہاں ہوا تھا؟ ہم سمجھتے ہیں کہ ہماری حالت اس وقت بعینہ ویسی ہی ہو چکی ہے جیسی قوم مدین کی تھی۔ اس قوم کے متعلق جو کچھ قرآن کریم نے کہا ہے وہ ہر قلب حساس کے لئے سامان صد ہزار عبرت اپنے اندر رکھتا ہے۔ سورہ ھود میں ہے۔

اور اسی طرح ہم نے قوم مدین کی طرف' ان کے بھائی بند' شعیبؑ کو بھیجا۔ اس نے ان سے کہا کہ تم (اپنے آئین و رسوم کو چھوڑ کر) صرف خدا کے قوانین کی اطاعت اختیار کر لو۔ اس کے سوا تمہارے لئے کوئی صاحب اقتدار نہیں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ اس وقت تو تم بڑے خوش حال ہو' لیکن تم نے اپنے معاشرہ میں سخت ناہمواریاں پیدا کر رکھی ہیں۔ اس حالت کو بدلو۔ اپنے ناپ تول کے پیمانوں کو پورا رکھو۔ ہر ایک کو اس کا پورا پورا حق دو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو مجھے خطرہ ہے کہ تم پر ایسی تباہی آ جائے گی جو تم سب کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی۔

اے میری قوم کے لوگو! اپنے معاشی نظام کی بنیاد عدل و انصاف پر رکھو اور کسی کے حق میں کمی نہ کرو۔ ایسا کرو گے تو ملک میں سخت ناہمواریاں (فساد) پیدا ہو جائیں گی اور معاشرہ تہس نہس ہو جائے گا۔

یاد رکھو! جو کچھ تم اس طرح فریب کاری اور سلب و نہب سے اکٹھا کر لیتے ہو' اگرچہ وہ بظاہر بہت کچھ نظر آتا ہے لیکن وہ تمہارے لئے قطعاً نفع بخش نہیں ہو سکتا۔ ثبات و دوام صرف ان مفادات کے لئے ہے جو قوانین خداوندی کے مطابق حاصل کئے جائیں۔۔ اور خدا کا قانون یہ ہے کہ ثبات و دوام اسے حاصل ہو سکتا ہے جو نوع انسان کے لئے منفعت بخش ہو۔ لیکن یہ بات تمہاری سمجھ میں اس وقت آ سکتی ہے جب تم خدا کے قانون کی صداقت کو تسلیم کرو۔ اگر تم اسے تسلیم نہیں کرتے' تو تم سے اسے جبراً نہیں منوایا جا سکتا۔ میرا کام تم تک اس پیغام کو پہنچا دینا تھا۔ میں تم پر داروغہ بنا کر نہیں بھیجا گیا جو تم سے جبراً یہ کچھ منواؤں۔ (مفہوم القرآن، 26۔11:84)

ہم سمجھتے ہیں کہ اس باب میں اس سے زیادہ اور کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ جب تک قوم۔ خدا کے قانون مکافات عمل پر ایمان نہیں لاتی۔۔ یعنی اسے ایک حقیقت کے طور پر تسلیم نہیں کرتی۔۔ اس کی حالت میں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔۔ اور جب تک یہ اپنی موجودہ روش میں تبدیلی پیدا نہیں کرتی' یہ تباہی سے بچ نہیں سکتی۔ یہ خدا کا قانون ہے۔

وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ﴿٦٢﴾ (33:62)

اور خدا کے قانون میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی۔

حذر اے چیرہ دستاں! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

ملک منظور حسین لیل۔ بھکر
0332-7636560
mhleeladv@yahoo.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پرویز صاحبؒ اور اُن کے نظریات کا تعارف

(کچھ وضاحتیں)

شرک کیا ہے؟:

شرک کو اللہ تعالیٰ نے ظلمِ عظیم اور نا قابلِ معافی جرم قرار دیا ہے۔ ہمارے ہاں صرف پیروں فقیروں (اولیاء وغیرہ) کو خدا کا ہمسر قرار دینے کو شرک سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ شرک اس سے زیادہ وسیع معانی کا حامل ہے۔ پرویز صاحب نے اپنی تحریروں میں قرآن کریم سے ماخوذ تقریباً تمام اقسامِ شرک کو بار بار پیش کر کے ہمیں یاد دلایا ہے کہ شرک کیا ہے اور اس سے اجتناب کیوں ضروری ہے۔ مثلاً انسانوں کو یا کسی بھی چیز کو، کسی بھی انداز میں خدا کے برابر درجہ دینا شرک ہے، حتیٰ کہ حضور نبی اکرم ﷺ کو بھی کسی بھی طرح خدا کا ہمسر نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کی عبادت، کسی بھی انداز میں کرنا، حتیٰ کہ حضور کریم ﷺ کی عبادت بھی، کسی بھی انداز میں کرنا شرک ہے۔۔ کلمٰت اللہ یعنی خدا کا قانون (قرآن کریم) نا قابلِ تغیر و تبدل ہے۔ یہی حیثیت، درجہ اور خصوصیت کسی انسان کے وضع کردہ قانون (فقہ وغیرہ) کو، حتیٰ کہ حضور کریم ﷺ کے اقوال و افعال (احادیث وسنت) کو دے دینا شرک ہے۔۔ خدا کے مقابلہ میں، اپنے جذبات (یعنی اپنی مرضی) کے پیچھے (نہ کہ قرآن کے ماتحت) چلنا شرک ہے۔۔ زمین کی مالک اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ اس پر کسی انسان کو ذاتی ملکیت کا حق حاصل نہیں۔ اس پر اپنا یا کسی اور کا حقِ ملکیت تسلیم یا ظاہر کرنا شرک ہے۔۔۔ اللہ تعالیٰ کے دین (اسلام) کے مقابلہ میں کسی بھی دوسرے دین یعنی نظامِ زندگی (جسے جامع طور پر سیکولرازم کہا جاتا ہے جس میں:۔ دہریت، لبرل ازم، ملوکیت، مغربی جمہوریت، نظامِ سرمایہ داری، سوشلزم، کمیونزم، تصوف، مذہبیت، مذہبی پیشوائیت، امتِ مسلمہ کے اندر مختلف مذاہب، فرقوں، سیاسی و دیگر جماعتوں، الگ الگ مساجد اور الگ الگ نمازوں وغیرہ کا وجود شامل ہے) کو تسلیم کرنا اور اس پر عمل کرنا شرک ہے۔۔ اسی طرح دنیا کے تمام مسلمانوں کے لئے مرکزِ اطاعت و توجہ، مکہ مکرمہ میں کعبۃ اللہ کو قرار دیا گیا ہے۔ دینی یا دنیاوی (سیاسی) لحاظ سے دنیا کے کسی اور مقام (ماسکو، واشنگٹن۔ بیجنگ وغیرہ) کو (عملاً) یہی درجہ دے دینا بھی شرک ہے وغیرہ وغیرہ۔ آج ہم جس سب سے بڑے شرک میں مبتلا ہیں وہ ہے فرقہ بندی۔ اللہ تعالیٰ کے قانون (قرآن کریم) نے فرقہ بندی کو واضح طور پر شرک، بلکہ شرک سے بھی بڑا جرم قرار دیا ہے (96-20:90) کیونکہ تفرقہ، توحید کی ضد ہے۔ لیکن بد قسمتی سے ہمیں اسی شرک کا احساس نہیں۔ یہ بڑا نازک معاملہ ہے۔ اس میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔۔ لہٰذا ہمیں اس قسم

کے تمام مشرکانہ تصورات اور نظریات و اعمال کا ادراک اور احساس ہونا چاہیئے۔ ورنہ ہم غیر معلوم اور غیر محسوس طور پر شرک، کفر اور ارتداد میں مبتلا رہیں گے۔ ہمیں معلوم ہونا چاہیئے کہ جونہی کوئی شخص خود کو شیعہ، سنی، دیوبندی، بریلوی، اہل حدیث، اہلِ قرآن وغیرہ کہتا ہے، وہ اُسی وقت (قرآن کی وعیدوں اور فیصلوں کے مطابق) مشرک، کافر اور مرتد ہو جاتا ہے۔۔اس بارے میں تبویب القرآن کا باب ''شرک'' قابلِ ملاحظہ ہے (مؤلف)۔

باطل کے نظام:

طلوعِ اسلام نومبر 1982ء، صفحہ نمبر: 44، ''قرآن کریم جس ''دین'' کو نوعِ انسانی کے لئے باعثِ برومندی قرار دیتا ہے اس کی رو سے ہر وہ نظام جو انسانیت کی فوز و فلاح کے راستے میں حائل ہو، باطل، فلہٰذا ابلیسی ہے۔ جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا تھا، اصولی طور پر وہ اس نظام کو تین شقوں میں تقسیم کرتا ہے۔۔۔وہ سیاسی نظام جس میں ایک انسان کسی دوسرے انسان یا انسانوں کے گروہ کے احکام کی اطاعت پر مجبور ہو، وہ ملوکیت یا آمریت کی شخصی حکومت ہو یا مغربی جمہوریت، عملاً دونوں میں بعض انسان، دوسرے انسانوں پر حکومت کرتے ہیں۔ اسے عصر حاضر کی اصطلاح میں ''سیکولرازم'' بھی کہا جاتا ہے۔ اس نظام کا نمائندہ ''فرعون'' تھا۔ دوسرے، اندھی عقیدت کا وہ نظام جس میں انسانوں کا ایک گروہ، دوسرے انسانوں کی فکری صلاحیتوں کو مفلوج کر کے، ان کے قلب و دماغ پر اپنی حکمرانی مسلط کر دے۔ اسے مذہبی پیشوائیت کا نظام کہا جاتا ہے جس کا نمائندہ ''ہامان تھا۔'' اور تیسرے وہ معاشی نظام جس میں ایک انسان، روٹی کے لئے دوسرے انسان کا محتاج ہو جائے۔۔۔اسے نظامِ سرمایہ داری سے تعبیر کیا جاتا ہے جس کا نمائندہ ''قارون'' تھا۔۔قرآن کی رو سے ''دین'' کا نظام قائم نہیں ہو سکتا جب تک باطل کے ان نظامہائے حیات کو مٹایا نہ جائے۔۔لیکن وہ انہیں مٹانے کا طریق عوامی تحریک قرار نہیں دیتا جس میں جذبات کو مشتعل کر کے، تخریبی سرگرمیاں اختیار کی جاتی ہیں۔ وہ اس کا طریقہ، فکری تحریک تجویز کرتا ہے جس میں قلب و دماغ کی داخلی تبدیلی سے خارجی احوال و ظروف میں تبدیلی پیدا کی جاتی ہے۔

داخلی تبدیلی:

''تبدیلی پیدا کیا کی جاتی ہے۔''۔قلب و نگاہ کی تبدیلی کا فطری نتیجہ خارجی ماحول کی تبدیلی ہوتا ہے۔ قرآن کریم نے اس بنیادی حقیقت کو ان بصیرت افروز الفاظ میں بیان کیا ہے کہ: اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِھِمْ ط (13:11) جب تک کوئی قوم اپنی داخلی (نفسیاتی) دنیا میں تبدیلی نہیں پیدا کرتی، خدا اس کے خارجی احوال میں تبدیلی پیدا نہیں کرتا''۔۔''قرآن کا مقصد، انسانی قلب و نگاہ میں اسی قسم کی (نفسیاتی) تبدیلی پیدا کرنا ہے۔''۔''نوعِ انسانی کا وہ عظیم ترین انقلاب، جو آج سے چودہ سو سال پہلے حضور نبی اکرم ﷺ اور آپ کے رفقائے جلیل ؓ کے مقدس ہاتھوں سے رونما ہوا تھا اس کے لئے یہی طریق اختیار کیا گیا تھا۔۔اس مقام پر میں اتنا اور واضح کر دوں کہ قرآن کریم کی رو سے، کسی مقصد اور اس کے حصول کے طریق میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔''Means are justified by the ends achieved'' میکیاولی سیاست کا اصول ہے، قرآن کا نہیں۔ قرآن کی رو سے، غلط راستہ صحیح منزل تک کبھی نہیں پہنچا سکتا۔۔اس لئے قرآنی

انقلاب میں جہاں صحیح منزل کا تعین حق کے مطابق ہونا چاہئے، اس کے حصول کا طریق بھی مبنی برحق ہونا چاہیئے۔ اس انقلاب کے لئے جس کی طرف میں نے ابھی ابھی اشارہ کیا ہے، حضور نبی اکرم ﷺ نے اپنی دعوت کا آغاز کیا تو اس وقت (حضور ﷺ کے سوا) دنیا میں کوئی مسلم نہیں تھا۔ آپ ﷺ نے اس نظامِ نو کے اصول و اقدار اپنی قوم کے سامنے پیش کئے اور پیش کرتے چلے گئے۔ قوم نے اس دعوت کی مخالفت کی لیکن ان میں ایسے افراد بھی تھے، جنہوں نے اس پر، سکون و اطمینان سے غور و فکر کیا اور اس کے بعد، جب وہ اس کی صداقت کے متعلق، دل اور دماغ کی کامل رضامندی سے مطمئن ہو گئے تو انہوں نے اسے قبول کرنے کا اقرار کیا اور اس طرح اس سوسائٹی کے ممبر بن گئے جس کی طرف حضور ﷺ دعوت دیتے تھے۔۔ جو لوگ اس طرح اس سوسائٹی کے ممبر بنتے تھے، ان کی تعلیم و تربیت کا خصوصی انتظام خود نبی اکرم ﷺ فرماتے تھے۔۔ قرآن کریم نے جو حضور ﷺ کی یہ خصوصیتِ کبریٰ بیان کی ہے کہ: وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ (2:151) تو وہ اسی حقیقت کی وضاحت کرتی ہے۔ یعنی حضور ﷺ انہیں اس نظام کے قواعد و ضوابط کی تعلیم دیتے تھے۔۔ اس کی حکمت و غایت سے آگاہ کرتے تھے اور اس کے ساتھ ہی ان کی انسانی صلاحیتوں کی نشوونما کرتے چلے جاتے تھے۔ ''صلاحیتوں کی اس نشوونما'' سے مراد صرف ذہنی صلاحیتیں نہیں، اس سے مفہوم ان صلاحیتوں کی نشوو ارتقاء بھی ہے۔ جن کی بنیادوں پر انسانی سیرت و کردار کی بلند و بالا عمارت استوار ہوتی ہے۔۔ اسے انسانی ذات کی نشوونما بھی کہا جاتا ہے۔۔۔ اسی سے ابن آدم، حیوانی سطح سے بلند ہو کر انسانی سطح پر زندگی بسر کرنے کے قابل ہو جاتا ہے''۔۔ اور اس ساری تعلیم و تربیت اور جد و جہد کا مقصود، انسانیت کی فلاح و کامرانی کے لئے حکومتِ خداوندی کا قائم کرنا ہے۔

حکومتِ خداوندی:

یہ امر خصوصی طور پر پیشِ نظر رہنا ضروری ہے کہ پرویز صاحب قرآن کریم کو مکمل دین اور انسانیت کے مسائل کا مکمل حل سمجھتے ہیں جس کے لئے ایک قرآنی مملکت اور حکومت کا قیام قرآن کریم کا تقاضا ہے (جو لوگ ما انزل اللہ یعنی قرآن کریم کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے، وہی لوگ کافر ہیں۔ (5:44) نزولِ قرآن کا اصل مقصد ایک ایسی حکومت کا قیام ہے جس میں انسانیت کو ہر قسم کی غلامی اور ظلم و جبر سے نجات مل جائے۔ ان کی ہر تحریر میں موجود قرآن کریم کی ہر آیت کے مفہوم کا رُخ ایک قرآنی حکومت کے قیام کی طرف نظر آتا ہے۔ (دیگر تحریروں کے علاوہ ''مفہوم القرآن'' اس مقصد و تقاضائے قرآن کا ایک مربوط و مسلسل نمونہ ہے۔ انہوں نے قرآن کریم کی ہر آیت اور ہر لفظ کا مفہوم اسلامی حکومت کے قیام اور اغراض و مقاصد کو سامنے رکھ کر متعین کرنے کی کوشش کی ہے)۔

قانون سازی:

طلوعِ اسلام، اکتوبر 1979ء، ص: 9 تا 21: ''قرآن مجید نے جن امور کی تفصیلات خود متعین نہیں کیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ انہیں ہمیشہ کے لئے غیر متبدل اور ابدی قرار دینا منشائے خداوندی نہیں تھا۔ اس نے اصول اور حدود متعین کر دیئے اور اسے امت کی صوابدید پر چھوڑ دیا کہ وہ ان حدود کے اندر رہتے ہوئے ان کی تفاصیل اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق خود

متعین کرے۔ یہ حدود اور اقدار تو ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہیں گی لیکن ان کی جزئیات اور انہیں روبہ عمل لانے کا طریق ضروریاتِ زمانہ کے مطابق بدلتا رہے گا۔'' پرویز صاحب کی نظر میں ایک قرآنی حکومت میں قانون سازی کو بنیادی اہمیت حاصل ہے کیونکہ نئے پیش آنے والے تمام مسائل ومشکلات کا حل قانون سازی کے ذریعے تلاش کیا جا سکتا ہے۔ پرویز صاحب کا زور ہمیشہ اور ہر مقام پر اس امر پر رہا ہے کہ قرآن کریم کی حدود کے اندر رہتے ہوئے زمانے کے بدلتے تقاضوں کا ساتھ دینے کے لئے قانون سازی ضروری ہے (حتیٰ کہ عبادات، نماز وغیرہ کے اختلافات کو حل کرنے کے لئے بھی)۔ قانون سازی پوری امت (وقت کی پارلیمان) کی باہمی مشاورت سے ہوگی۔ کوئی شخص اپنے علم کی روشنی میں قانون سازی کے لئے اپنی تجاویز بطور مشاورت تو پیش کر سکتا ہے مگر کوئی فردِ واحد قانون سازی کا مجاز نہیں۔ قوانین حالات کے بدلتے تقاضوں کے تحت بدلتے رہیں گے۔ کیونکہ تبدیلی صرف قرآن کریم میں نہیں ہوسکتی، باقی تمام معاملات میں امت کی باہمی مشاورت سے، قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے تبدیلی کی جاسکتی ہے۔۔۔ قانون سازی کا یہ وہ عمل ہے جو وحی کا سلسلہ ختم ہونے کے بعد قیامت تک انسانیت کی راہنمائی کرتا چلا جائے گا۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ قرآن کریم ہر دور میں انسانیت کے تمام مسائل کے حل کے لئے کافی ہے (29:51) قرآن کریم کے کافی ہونے کی عملی صورت قرآنی احکامات کے تحت مسلسل قانون سازی ہے۔ اور ہم جو کہتے ہیں کہ ختمِ نبوت کے بعد آنے والے تمام زمانوں کے لئے اسلام ہماری مکمل راہنمائی کرنے کا اہل ہے تو اس کا مطلب یہی ہے اور اس کا عملی طریق یہی (قانون سازی) ہے۔ اسلامی نظام میں اہم ترین نکتہ قانون سازی ہے، جسے سمجھے اور تسلیم کئے بغیر ہم ثابت نہیں کر سکتے کہ اسلام ہر دور میں انسان کے مسائل حل کر سکتا ہے۔۔۔ یہ حقیقت ہمارے سامنے ہے کہ (حضور نبی کریم ﷺ کے تقریباً ڈیڑھ دو سو سال بعد) ائمہ فقہ کے زمانے میں، نئی قانون سازی کی ضرورت پیش آ گئی تھی لیکن آج مذہبی لوگ نئی قانون سازی کی ضرورت کو نہیں مانتے۔ (یاد رہے کہ ان ائمہ فقہ نے، مرکزی اتھارٹی برائے قانون سازی ختم ہو جانے کے بعد، انفرادی طور پر قانون سازی کی۔ حتیٰ کہ انہوں نے اپنے طور پر عبادات (نمازوں وغیرہ) کی ادائیگی کے طریقے بھی بتائے۔۔۔ لیکن مرکزی اتھارٹی کے خاتمے کی وجہ سے اس انفرادی قانون سازی کا نتیجہ الگ الگ نمازوں، الگ الگ مساجد یعنی الگ الگ فرقوں کی صورت میں سامنے آیا جس نے امت کا شیرازہ بکھیر کر رکھ دیا۔ اب بھی نئی قانون سازی قرآن کریم کی حدود کے اندر رہتے ہوئے پوری امت کی باہمی مشاورت سے ہوگی نہ کہ انفرادی طور پر۔ مؤلف)۔

آئیڈیل ازم:

پرویز صاحب کے نظریات (خصوصاً اسلامی مملکت) کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ قابلِ عمل نہیں۔ وہ ایک یوٹوپیا کا تصور پیش کرتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر پرویز صاحب (IDEALISM) کا شکار ہیں جبکہ حقیقت یہ ہے کہ پرویز صاحب قرآن کریم کو مکمل طور پر ممکن العمل مانتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ وہ ان باتوں، اور حالات سے قطعاً مایوس نہیں ہیں کیونکہ قرآن کا

طالب علم مایوسی کا شکار کبھی نہیں ہوسکتا۔ تاریخ انسانی میں قرآن پر پہلے بھی عمل کیا جاچکا ہے،، اب بھی ہوسکتا ہے اور ایسا ہوکر رہے گا۔ علاوہ ازیں، آئیڈیلزم کا بھی ایک فائدہ ہے کہ کسی نظریہ یا عمل کی آخری حد ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ ہمیں چاہیئے کہ ہم اپنی استطاعت کے مطابق جس حد تک ہوسکے اُس نظریہ پر عمل کرنے کی کوشش کریں۔ مثلاً حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اگر فرات کے کنارے ایک کتا بھی بھوکا مرگیا تو عمر سے اس کا حساب لیا جائے گا۔ اب اس نظریہ پر سو فیصد عمل کرنا شاید انسان کے لئے ممکن نہ ہو، لیکن اس کا مطلب واضح ہے کہ معاشی انصاف مہیا کرنے کے لئے آخری حد تک کوشش کرنی چاہئے (مؤلف)۔

فرشتے کہاں سے آئیں؟:

آج تک ایسا نہیں ہوا کہ عالمِ انسانیت میں سے برائی کبھی مکمل طور پر مٹ گئی ہو اور غلطیوں سے یکسر پاک، سو فیصد منصفانہ نظام قائم ہوسکا ہو۔ اگر تمام لوگ اچھے ہوں تو پھر کسی نظام کی ضرورت نہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ انسانی معاشرے میں اچھے اور برے، ہر قسم کے لوگ ہمیشہ موجود رہے ہیں۔ انسان صاحبِ اختیار و ارادہ پیدا کیا گیا ہے۔ وہ اپنے اختیار و ارادہ سے کام لیتے ہوئے، اچھائی یا کسی بھی برائی کو اپنا سکنے میں آزاد ہے۔ وہ اپنی کم علمی، کم فہمی یا اپنے ذاتی مفادات کے تحت کوئی سی بھی سوچ یا کوئی سا بھی عمل اپنا سکتا ہے۔ اور وہ آغازِ انسانیت ہی سے اپنے اختیار و ارادہ کو بروئے کار لاتے ہوئے (اپنے مسائل کے حل کے لئے) مختلف قسم کے تصورات و نظریات قائم کرتا آیا ہے اور اُن پر عمل بھی کرتا آیا ہے مگر انسانی تصورات، نظریات اور اعمال کبھی بھی غلطیوں اور خامیوں سے پاک نہیں رہ سکے۔ لہٰذا، صاف ظاہر ہے کہ انسانی معاشرے میں سو فیصد اچھے لوگ نہ کبھی پہلے پائے گئے اور نہ کبھی آئندہ پائے جائیں گے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ معاشرے کے توازن کو برقرار رکھنے کے لئے معاشرے میں موجود افراد ہی میں سے کچھ افراد کو منصفانہ نظام قائم کرنے کی ذمے داری سونپنا ہوگی کیونکہ عالمِ انسانیت کو سو فیصد غیر منصفانہ نظامِ معاشرت (سیاست و معیشت) کے حوالے کر دینا بھی قابلِ قبول نہیں اور نہ ہی دانشمندی! سوال پیدا ہوتا ہے (اور اکثر کہا جاتا ہے) کہ جی! ''فرشتے'' (معصوم عن الخطا انسان) کہاں سے لائے جائیں جو نظریاتی اور عملی طور پر سو فیصد کمال کے لوگ ہوں؟۔ یہی وجہ ہے کہ محترم پرویز صاحب کے پیش کردہ قرآنی نظام کو ایک ''یوٹوپیا'' (آئیڈیل یعنی ناقابلِ عمل نظام) کہا جاتا ہے۔ قرآنِ کریم بلاشبہ ایک مثالی (آئیڈیل) نظامِ معاشرت (SOCIAL ORDER) پیش کرتا ہے جس پر عمل کرنے کو ناممکن سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ تاریخ کے ایک دور میں یہ کامیابی سے نافذ ہو چکا ہے اور آئندہ بھی اس میں نافذ ہونے کی پوری پوری صلاحیت موجود ہے۔ قرآنِ کریم کے حقائق کی بجائے مسلمانوں کے صدیوں پر محیط غلط اور صحیح کے ملغوبہ نظریات و اعمال کو مثال کے طور پر پیش کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ اب قرآن پر عمل کرنا ممکن نہیں۔ مسلمانوں کی غلطیوں کو قرآنِ کریم کی غلطیاں تو نہیں کہا جاسکتا۔ کیونکہ حضور ﷺ اور اُن کے صحابہؓ کے بعد مسلمان یا تو قرآنِ کریم کو صحیح طور پر سمجھ نہیں پائے یا اپنے ذاتی مفادات کے سبب وہ قرآنِ کریم پر عمل نہیں کر سکے۔ لیکن اِن تلخ حقائق کی موجودگی کے باوجود یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مسلمانوں کا کوئی بھی فرقہ نہ

تو مکمل طور پر غلط ہے اور نہ ہی مکمل طور پر صحیح ہے۔ غلط کو صحیح سے الگ کرنے کے لئے معیار کسی انسان کی ذاتی رائے کو نہیں بلکہ قرآن کریم کو بنانا ہوگا۔ وحی کا عطا کردہ نظام انسانی تصورات اور نظریات واعمال کو REGULATE CONTROL and کرتا ہے۔ اور اگر پوری امت (حکمران اور عام مسلمان) اس امر پر عملاً سختی سے کاربند ہو جائے کہ جو کچھ (جو تصور، جو نظریہ یا عمل یا، کسی تصور، نظریہ وعمل کا جتنا حصہ) قرآن کریم کے خلاف ہوگا وہ غلط، اور جو کچھ خلافِ قرآن نہیں ہوگا، اسے صحیح مانا جائے گا تو مسلمانوں کے تمام تصورات، نظریات واعمال متفقہ طور پر صحیح قرار پائیں گے یعنی Regulate ہو جائیں گے، اختلافات مٹ جائیں گے اور کسی فرشتے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ امت خود ہی اصولِ مشاورتِ باہم سے تمام مسائل کا حل ڈھونڈ لے گی او انفرادی واجتماعی طور پر اپنی غلطیاں خود ہی درست کر لے گی۔

مایوسی کا علاج:

طلوعِ اسلام جولائی 1984ء، ص:8: ''قرآن مایوسی کو کفر قرار دیتا ہے۔۔ مایوس وہ ہوتا ہے جس کے سامنے کوئی راستہ نہ رہے۔ اور قرآن ہر حالت (Situation) میں انسان کی راہنمائی کرتا ہے۔ اس نے ہماری مایوسی کا بھی علاج بتایا ہے۔۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ہم اسی علاج کو اختیار تو ایک طرف، تسلیم کرنے کے لئے بھی تیار نہیں ہوں گے۔ سنئے وہ علاج کیا بتاتا ہے۔: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا (4:136) ''اے وہ! جو مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتے ہو'' غور کیجئے!۔ یہاں خطاب ''ایمان والوں'' سے کیا گیا ہے، اور ان سے کہا گیا ہے۔ ''اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ (4:136) ''تم ایمان لاؤ اللہ پر، اس کے رسول ﷺ پر، اور اس کتاب پر جو اس رسول ﷺ پر نازل کی گئی تھی۔'' آپ نے کچھ سمجھا کہ بات کیا ہوئی؟۔ وہ ہمارے دعوائے ایمان کو ایمان ہی تسلیم نہیں کرتا۔ وہ ہم سے بھی ایمان لانے کا مطالبہ کرتا ہے۔ وہ موجودہ مسلمانوں میں سے اس امت کی تشکیل کرنا چاہتا ہے جو قرآن پر ایمان لا کر امتِ مسلمہ ہونے کا دعویٰ کرے۔ قرآن پر ایمان لانے کے معنی یہ ہوں گے کہ وہ قوم یہ فیصلہ کرے (اور اس فیصلہ پر عمل کرے) کہ اس کے تمام معاملات قرآن کے مطابق طے پائیں گے۔۔ یہ ہوگی وہ امت جس کے افراد ایک دوسرے کے بھائی ہوں گے (فاصبحتم بنعمتہٖ اخوانا) اور ان کے دل ایک دوسرے سے جڑے ہوئے (فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ (3:103))۔ یہ امت تمام خارجی نسبتوں (رنگ، نسل، زبان، نسب، وطن، حتیٰ کہ شیعہ۔ سنی۔ مقلد، غیر مقلد۔ حنفی۔ شافعی۔ وغیرہ نسبتوں) سے پاک ہوگی۔ اور اپنے آپ کو صرف ''مسلم'' کے تشخص سے متعارف کرائے گی۔ (هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ۙ (22:78))۔۔ اگر یہ نہیں ہوگا تو مسلمانوں کی موجودہ مملکتوں میں (دوسری قوموں کی طرح) سیاسی معاہدات ہو سکیں گے، اتحادِ ملّی نہیں ہو سکے گا۔''

امید کی کرن:

طلوعِ اسلام جنوری 1970ء، ص:30: ''حالات ہر چند بے حد تاسف انگیز اور حوصلہ شکن ہیں، لیکن جس امت کے پاس قرآن جیسا سرچشمہء حیات ہو، اس کے لئے مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ قرآن ہمیں زندگی کے ہر گوشے میں راہنمائی

دیتا ہے اور جو اس کی عطا کردہ راہنمائی کے مطابق عمل پیرا ہوتا ہے وہ کبھی ناکام نہیں رہتا۔ میں عزیزانِ من! قرآن کا ایک ادنیٰ طالب العلم ہوں۔ میں نے عمر کا بیشتر حصہ اس کتابِ عظیم میں غور وفکر میں بسر کیا ہے اور گزشتہ تیس سال سے مسلسل و پیہم، امت کے ان اجتماعی مسائل کے متعلق سوچتا اور لکھتا چلا آ رہا ہوں جن سے ہم اس وقت دوچار ہیں۔ مجھے اس باب میں قرآن اور تاریخ سے جو راہنمائی ملی ہے، میں چاہتا ہوں کہ اسے آپ احباب کے سامنے، کھلے کھلے الفاظ میں پیش کردوں۔ اس لئے بھی کہ میں اب عمر کی اس منزل میں پہنچ رہا ہوں جہاں کہنے کی بات کو فرصت کے کسی دوسرے موقع پر اٹھا رکھنے کا (Risk) نہیں لینا چاہیئے۔ میں عزیزانِ من! اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ:

(1) اسلام کا احیاء تو ایک طرف، اس کا سمجھنا بھی ہمارے مذہب پرست طبقہ کے بس کی بات نہیں۔ یہ اس لئے کہ جس اسلام کے یہ وارث اور عالم کہلاتے ہیں، وہ اسلام، وہ دین نہیں ہے جسے خدا نے نازل کیا اور اس کے رسول ﷺ کافتہ للناس نے قائم کر کے دکھایا۔۔۔ یہ اسلام، وہ مذہب ہے جو ہمارے دورِ ملوکیت اور سرمایہ داری میں وضع ہوا۔ اور جسے سند، قرآن کی نہیں، بلکہ صرف تاریخ کی حاصل ہے۔ مذہب میں اجتماعیت کا تصور ہی نہیں ہوتا۔ یہ افراد کا ذاتی معاملہ بن کر رہ جاتا ہے۔ یہ جو ہم اپنی نمازوں، عیدوں اور حج میں اجتماعات دیکھتے ہیں تو یہ دین کے بے جان پیکر ہیں۔ ان میں اوّل تو کوئی مقصد ہی سامنے نہیں ہوتا، اور اگر ہوتا ہے تو ہر ایک کے پیشِ نظر اپنی اپنی نجات کا سوال ہوتا ہے۔ امت کے اجتماعی مسائل کسی کے سامنے نہیں ہوتے۔ لہٰذا، اسلام صرف اس وقت زندہ ہو سکے گا، جب مذہبی پیشوائیت باقی نہ رہے۔

(2) دین میں، مذہبی فرقوں کا تصور تک نہیں ہو سکتا۔ اس میں ساری امت، امتِ واحدہ ہوتی ہے۔ فرقوں کا وجود مذہبی پیشوائیت سے وابستہ ہوتا ہے۔ مذہبی پیشوائیت مٹ جائے تو فرقے بھی باقی نہیں رہتے۔ اُس وقت ہر شخص اپنے آپ کو صرف مسلمان کہتا ہے۔

(3) دین میں، رنگ، زبان، نسل، جغرافیائی حدود کی بناء پر امتیازات باقی نہیں رہتے۔ اس میں وجہء جامعیت، اشتراکِ ایمان ہوتا ہے، اور بس!۔

(4) دین میں، سیاسی پارٹیوں کا وجود بھی نہیں ہوتا۔ اس میں ساری قوم کے لئے ایک نظامِ حکومت ہوتا ہے۔ اور ایک مرکز۔ دین کے تصور کی رو سے، دنیا میں دو ہی پارٹیاں ہوتی ہیں۔۔ ایک حزب اللہ اور دوسری حزب الشیطان۔

(5) دین میں، اطاعت خدا کے احکام وقوانین کی ہوتی ہے جنہیں اُس نے اپنی کتابِ عظیم میں نہایت وضاحت سے محفوظ کر دیا ہے۔ اس کتاب کا دعویٰ یہ ہے کہ اس میں کوئی اختلافی بات (تضاد) نہیں۔

(6) قرآن میں، بجز معدودے چند تفصیلی احکام کے، دین کے اصول دیئے گئے ہیں اور مستقل اقدارِ حیات۔ یہ اصول و اقدار ہمیشہ کے لئے غیر متبدل ہیں لیکن ان کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے، ہر دور کی امت، اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق، باہمی مشاورت سے، جزئی قوانین خود مرتب کرتی ہے۔۔ ایسا کرنے میں وہ لازماً، ان تفصیلات سے استفادہ کرتی ہے جو اس

سے پہلے اپنے اپنے زمانے میں، ان کے پیشروؤں نے مرتب کی تھیں۔ یہ قوانین حکومت کی طرف سے نافذ ہوتے ہیں اور اختلافی مسائل میں رجوع بھی اسی کی طرف ہوتا ہے۔۔اس کے لئے عملی طریق کیا ہوتا ہے، اسے ہر دور کی حکومت خود متعین کرتی ہے۔

(7) دین کا مقصود و منتہیٰ یہ ہے کہ دنیا میں کوئی شخص نہ کسی دوسرے شخص کا محکوم رہے نہ محتاج۔۔۔انسانوں کی محکومی تو یوں ختم ہوجاتی ہے کہ اس میں اطاعت خدا کے احکام و اصولات کی ہوتی ہے۔۔۔محتاجی کے ختم کرنے کے لئے وہ ایسا معاشی نظام قائم کرتا ہے جس میں، ذرائع رزق کسی فرد، گروہ یا اربابِ حکومت کی ملکیت میں رہنے کی بجائے، امت کی تحویل میں رہتے ہیں تاکہ ان سے تمام افراد کی ضروریاتِ زندگی پوری ہوتی رہیں۔ ذاتی ملکیت کے اس طرح ختم ہوجانے سے، وہ تمام خرابیاں اور جرائم خود بخود نیست و نابود ہوجاتے ہیں جو ارتکازِ دولت اور جذبہء استحصال (Exploitation) کا فطری نتیجہ ہیں۔

(8) اس طرح ہر فرد جب، آزاد اور مستغنی عن الغیر ہوجاتا ہے، تو اس کے لئے، مستقل اقدارِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لئے فضا سازگار ہوجاتی ہے۔۔اس سے اس کی ذات ایسی نشوونما حاصل کرلیتی ہے جس سے وہ موجودہ زندگی سے اگلی زندگی کی ارتقائی منزل طے کرنے کے قابل ہوجاتی ہے۔ اس طرح اس امت کے افراد کی یہ دنیا بھی حسین اور خوشگوار ہوجاتی ہے، اور آخرت بھی سرسبز و شاداب!۔''

اُمت کا مستقبل:

پرویز صاحب کا مطالعہ کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اُمت کے مسائل کا حل، مستقبل کی کامیابی اور تابناکی صرف اور صرف تمسک بالقرآن (قرآن کریم اور صرف قرآن کریم پر کامل یقین اور اس پر خلوصِ نیت سے عمل کی پوری پوری کوشش اور ایک حقیقی قرآنی مملکت کے قیام) سے وابستہ ہے۔۔۔بصورت دیگر امت اشتراکِ دین کی بنیاد پر ایک قوم بننے کی بجائے، آج کی طرح ہمیشہ، مختلف قسم کے (علاقائی، وطنی، لسانی، ثقافتی، خون، رنگ و نسل، امارت و غربت، حاکم و محکوم، عوام و خواص، کمزور اور طاقتور وغیرہ جیسے مختلف طبقاتی تقسیم کے) تعصّبات کی بناء پر ٹکڑوں ٹکڑوں (گروہوں، فرقوں، جماعتوں، اور سیاسی پارٹیوں وغیرہ) میں منقسم رہے گی جس سے وہ کمزور سے کمزور تر ہوتی چلی جائے گی اور کبھی بھی قرآن کریم کے پیش کردہ (اپنے اور انسانیت کے تابناک مستقبل کے اعلیٰ) مقصد کو حاصل نہیں کر پائے گی۔ اور حضور نبی اکرم ﷺ قیامت کے روز خدا کی بارگاہ میں ہماری شکایت فرمائیں گے کہ ہم نے اللہ کے اس قرآن کو چھوڑ رکھا تھا (25:30) (مؤلف)۔ (جاری ہے)

سانحہ ارتحال

بزم طلوع اسلام چوٹی زیریں کے فعال اور سرگرم رُکن محترم عبدالستار کھوسہ اس دارِفانی سے رحلت کر گئے ہیں۔ دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت عطا کرے۔ ادارہ مرحوم کے پس ماندگان، لواحقین اور اعزہ و اقرباء کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شیخ اللہ دتا

سابق سیکرٹری حکومت پنجاب، ایڈووکیٹ ہائی کورٹ، لاہور

(ڈاکٹر ناصر رانا اور پروفیسر شاہد نسیم کی تالیف ''تقریب 2016'' مختلف شعبہ ہائے حیات کی شخصیات سے انٹرویوز پر مشتمل ہے۔ ان مکالموں کو انہوں نے صیغہ واحد متکلم میں ڈھال کر مخصوص اُسلوب میں پیش کیا ہے۔ ہمارے شیخ اللہ دتا صاحب کا انٹرویو آپ کی دلچسپی کے لیے حاضرِ خدمت ہے۔)

میں۔۔۔ یکم اکتوبر 1940ء میں مقام ہوشیار پور مشرقی پنجاب میں پیدا ہوا۔

میں کون ہوں، آج تک کسی کو یہ پتا نہ چل سکا کہ وہ کون ہے۔ میں ایک ہستی ہوں جس کا میرے پاس کوئی ثبوت نہیں۔ لیکن میں یقین رکھتا ہوں کہ میں ہوں۔ چلا کہاں سے یہ بھی کوئی پتا نہیں۔

جب ہوش سنبھالا تو۔۔۔ میرا بہت سارا حصہ بن چکا تھا۔ قانوناً اخلاقاً جس کا میں ذمہ دار نہیں ہوں اور جو آج تک میری شخصیت کا حصہ ہے۔ جب ہوش آیا تو والدہ، والد صاحب کو قرآن پڑھتے دیکھا۔ وہ جھولی میں رکھ کر قرآن پاک پڑھتے جو آج تک میرے ساتھ ہے۔

کہاں جاؤں گا۔۔۔ جہاں یہ قرآن لے جائے گا۔ کوشش کی ہے کہ قرآن کریم کے الفاظ کو عملی جامہ پہنادوں جس حد تک ممکن ہو اور اس رخ پر رہوں جس رخ پر وہ رکھنا چاہتا ہے۔ بدنیتی نہیں کی عمل میں کوتاہی کا ذمہ دار ہوسکتا ہوں۔ اللہ اور رسول نے جدھر جانے کو کہا چلا جاتا ہوں ؎

چہرہ تیرا دل میں لیے چلتے رہے انگاروں پر تو ہو کہیں سجدے کیے ہم نے تیرے رخساروں پر

والد محترم کی اہم بات۔۔۔ 14، 15 سال کی عمر میں والد نے کہا میں تم کو ایک بات بتادوں جس پر عمل کر کے تم کبھی نہیں تھکو گے۔ تم میرا کہنا مانتے ہو ماں، استاد اور ساتھی کا بھی۔ اس کے مطابق جو کام کرنے والا ہو وہ کر بھی دیتے ہو۔ کل کو یہ سارے حالات اور لوگ نہ رہیں تو کیا تم اپنا عمل بند کر دو گے۔ اس لیے کوئی مستقل بنیاد کیوں تلاش نہیں کرتے تاکہ یہ کام ختم نہ ہو۔ عدم نے خوب کہا ؎

ایک دو ساغروں سے کیا ہوگا کوئی معقول انتظام کریں

والد محترم نے فرمایا۔۔۔ میں بتاتا ہوں اگر تم یہ کام اللہ کے لیے کرو تو اللہ کی ہستی تا ابد ہے اور وہ اپنے احکام نہیں بدلتا۔ اس کے مطابق چلو گے تو کبھی نہیں تھکو گے۔ مذہب کی زبان میں اسے للّٰہیت کہتے ہیں یعنی اللہ کے لیے ہونا۔ جہاں بھی وہ لے

جائے چلا جاؤں گا۔ کوتاہی عمل تو ہو سکتی ہے مگر میری بدنیتی نہیں ہے۔

خواب۔۔۔ تو سوتے ہوئے دیکھنا ہے۔ علامہ محمد اقبال کے نزدیک ''آئینہ ادراک میں جھانکنے کا نام بھی خواب ہے۔'' آنکھیں کھلی ہوتی ہیں آپ دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ تعمیرِ مستقبل کے لئے اپنا پروگرام طے کرتے ہیں وہی خواب کہلاتا ہے۔

پہلا خواب۔۔۔ آئینہ ادراک میں جس کو دیکھا۔ نہاں خانۂ لاہوت سے میرا پیوند ہے۔ پاکستان بنے گا، اور پاکستان بن گیا۔ دوسرا خواب ؎

اِک ولولۂ تازہ دیا میں نے دلوں کو — لاہور سے تا خاکِ بخارا و سمر قند
ہفت کشور جس سے ہو تسخیر بے تیغ و تفنگ — تو اگر سمجھے تو تیرے پاس وہ ساماں بھی ہے

علامہ اقبالؔ نے اس ہفت کشور کو مشترکہ طور پر کام کرتے دیکھا۔ اس طرح کا خواب میرے من میں بھی ہے۔ مگر اس کو کوئی روبہ عمل نہ لا سکا۔ سارے کام منصوبہ بندی سے کرتا ہوں۔ جو خود کر سکتا ہوں کرتا ہوں۔ ایک ایسا تعلیمی ادارہ بنانا چاہتا ہوں جس میں انسان کو انسان بنانا سکھایا جائے۔ تخلیق جدید کے لیے جو اشیاء درکار ہیں وہ پیدا ہوں۔ ایک نیا انسان پیدا ہو۔

خوشی۔۔۔ دنیا جہاں کی نفسیات میں خوشی اس کو کہتے ہیں جس سے خواہشات کی تکمیل ہو جائے۔ ناگوار ہے وہ جس کو کوئی اپنے خلاف سمجھے۔ ابا جی نے جو بات بتائی اس نے بے نیاز کر دیا۔ خوش اس پر ہو جس پر تیرا رب راضی ہو۔ جو اللہ کا ہو جاتا ہے اللہ اس کا ہو جاتا ہے اور اسی میں خوشی ہے۔ خوشی تو یہ ہے۔ ہندوستانی فلم کا گانا ہے ؎

تیری بانہوں کا گر ہو سہارا — پیا منجدھار بھی ہے کنارا

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔۔۔ کہ میں کائنات میں ہر جگہ موجود ہوں۔ کبھی تم نے محسوس کیا ہے کہ تیرے ساتھ بھی ہوں اور تمہیں پتا نہیں۔ میں نے تمہیں پیدا کیا اور تمہارے لیے سامان ربوبیت مہیا کیا۔ میں تمہیں نقصان نہیں پہنچانا چاہتا۔ میں تو تمہیں بانہوں میں سمیٹ کر آگے بڑھنا چاہتا ہوں۔ مگر تمہیں سچا اور صابر ہونا چاہیے۔ اس معیار پر اترو تو میری حقیقت کو محسوس کرو۔ غفلت میں بھی لمحات گزرے، میں نے وہ ساتھ محسوس کیا ہے۔ قرآن نے اس کا حوالہ دیا، حضرت موسیٰؑ قوم کو لے کر آزادی دلانے آئے ایک لاکھ لوگ ان کے ساتھ تھے۔ سمندر کے کنارے اور پیچھے فرعون کی فوج تھی۔

بوڑھوں نے کہا۔۔۔ مروانا ہی تھا تو یہاں کیوں لائے۔ موسیٰؑ کا جواب تھا کیا تم سمجھتے ہو میں اکیلا ہوں؟ تم احساس ہی نہیں رکھتے، میرے ساتھ میرا رب ہے۔ ابھی مجھے راستہ دکھائے گا۔ خدا ساتھ ہوتا ہے راستہ دکھانا اس کا کام اور چلنا آپ کو ہوتا ہے۔ خدا کا ساتھ ہو تو استقامت آتی ہے۔ حضور پاک ﷺ نے 13 سال مکے میں تبلیغ کی۔ مکے والوں نے معاذ اللہ قتل کرنے کا منصوبہ بنایا۔ گھر چھوڑا اور غار ثور میں چلے گئے حضرت ابوبکر صدیقؓ ساتھ تھے۔ دشمن غار کے دہانے تک آ پہنچے۔ انہوں نے عام چیزوں کو دیکھا یہ نہیں دیکھا تمہارے ساتھ کون ہے۔ مکڑی نے جالا تن دیا اور کبوتری انڈے دے گئی غار کے دہانے پر۔ حضور پاکؐ مطمئن تھے اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کچھ پریشان۔

یہ خوف کیا۔۔۔ خوف وہ جو باہر ہوتا ہے اپنے بارے میں ہوتا ہے۔ حزن ان کے بارے میں ہوتا ہے جو زیادہ عزیز

ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ کو محفوظ کر دیا۔

جب وہ کہتے تھے اپنے ساتھی کو دیکھو پریشان کیوں ہو رہے ہو۔ تمہیں پتا نہیں ہمارے ساتھ کون ہے، اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ منجدھار میں کنارا اس وقت ملتا ہے جب اللہ کا ساتھ ہو، میں نے بیسیوں بار اللہ کا ساتھ محسوس کیا۔ اگر اللہ کا ساتھ محسوس ہو آپ اس کے ساتھ چلیں تو پھر کوئی اور شے درکار نہیں ۔

تجھ سے مانگوں میں تجھی کو کہ سبھی کچھ مل جائے سو سوالوں سے یہی ایک سوال اچھا ہے

ایک مومن کو اس کے ساتھ ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ وہ انصاف، تقویٰ اور صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ اگر یہ چیز، یہ احساس۔۔۔ کہ خدا ساتھ ہے تو یہ تحفظ اور راہنمائی ملتی ہے جو کہیں اور سے نہیں مل سکتی۔ 1971ء میں PCS کا تحریری امتحان پاس کیا۔ زائد عمر کا مسئلہ پیدا ہوا میں لاہور آیا اپیل کرنے کے لیے۔ یہاں آ کر پتا چلا کہ میرا Candidautre بحال ہو گیا ہے۔ بس اڈے پر اسناد کا بیگ کوئی اٹھا کر لے گیا تھا۔ انٹرویو کے لیے اصل اسناد کا پیش کرنا ضروری تھا۔

قدرت نے یہ بتایا کہ یہ نوکری تم حاصل کر رہے ہو اور ہم تمہیں یہ نوکری دے رہے ہیں۔

جب۔۔۔ بیگ گم ہوا تو خیال آیا کہ یہ میری غلطی ہے۔ کنڈیکٹر نے پولیس چوکی پر بیگ گم ہونے کی اطلاع دے دی اور انہوں نے رپورٹ کی ایک کاپی بنا کر مجھے بھی دے دی۔

انٹرویو کے لیے 9 افراد آئے تھے۔ ایک ایک کو بلا کر اسناد چیک کر رہے تھے۔ مگر مجھے نہیں بلایا۔ مجھے کہا آپ کی اسناد درست ہیں ہم آپ کو چیک نہیں کریں گے۔ کوئی بظاہر ذریعہ نظر نہ آیا، کس نے ان کے ذہن میں ڈالا۔ سب نے کہا آپ کی اسناد چیک کرنے کی ضرورت نہیں۔ اور ندا آئی۔۔۔ ہم نے یہ بتانا تھا کہ نوکری کا انتظام ہم کر رہے ہیں اور تم اسناد لیے بیٹھے ہو۔ بیسیوں ایسے لمحات گزرے جب خدا کو اپنے ساتھ پایا۔ ابا جی نے رخ تبدیل کر دیا۔ سکھا دیا خدا کے لیے کیسے جیتے ہیں۔

غصہ آتا ہے۔۔۔ جب انسان کے جذبات کو ٹھیس پہنچتی ہے۔ قرآن نے ایک نسخہ بتا دیا جس سے کنٹرول کرتا ہوں۔ وہ نسخہ۔۔۔ جب غصہ آتا ہے تو اللہ کی حفاظت طلب کرتے رہیں۔ پہلے بے قابو ہوتا تھا اور اب ضبط میں ہے۔ دل میں یہ کہتا ہوں کہ میں خدا کی پناہ میں آتا ہوں اس کی طرف لوٹتا ہوں۔ اس سے غصہ بھی کافور اور مشکل بھی تحلیل ہو جاتی ہے۔ یہ ایک عمل جس کو اپنے نفس پر وارد کرتا ہوں۔

عرب بہادر عبدالوُد جو 4000 آدمی کے برابر سمجھا جاتا تھا۔ جنگ احزاب۔۔۔ میں خندق پار کرنے کی کوشش میں خندق میں گرا اور پار نہ جا سکا۔ حضرت علیؓ نے خندق میں چھلانگ لگا دی۔ لڑائی شروع ہو گئی عبدالوُد بوڑھا تھا حضرت علیؓ گرا کر اس کی چھاتی پر چڑھ گئے۔ اس نے غصے سے حضرت علیؓ کے چہرے پر تھوک دیا۔ حضرت علیؓ اسے چھوڑ کر کھڑے ہو گئے۔ اس نے کہا مجھے چھوڑ کیوں دیا۔ حضرت علیؓ نے جواب دیا میری اور تمہاری کیا دشمنی ہے۔ تم تو خدا اور رسولؐ کے دشمن

ہواس لیے تمہیں زیر کیا۔تم نے میری توہین کی اوراب اگر تمہیں قتل کرتا تو یہ ذاتی انتقام ہوتا۔میں اللہ کا بندہ Servant of Allah نہ ہوتا۔دوبارہ لڑائی شروع ہوئی اور حضرت علیؓ نے اسے قتل کر دیا۔خدا کے احکام کی جو خلاف ورزی کرے گا اس پر غصہ تو آئے گا اور یہ غصہ عمل پر بھی آمادہ کرتا ہے۔اگر اس پر بھی غصہ نہیں آتا تو معاملہ کچھ اور ہے۔غصہ آپ کی صلاحیتوں کو ابھارتا ہے اگر خدا کی بتائی ہوئی خصوصیات کے مطابق ہو جائے۔

زندگی اور زندگی کا مقصد کیا۔۔۔زندگی کے دو حصے ہیں۔گدھے کا بچہ پیدا ہوتا، کھاتا پیتا اور بڑا گدھا بن جاتا ہے اور پھر مرجاتا ہے۔ایک گدھا، گھوڑا، چڑیا، کوے کا بچہ کہہ لیں اگر اسے زندگی کہتے ہیں تو یہ سارے حیوانات میں ہے اور وہ تو ان زندہ لوگوں سے مخاطب ہے۔ہم نے قرآن اس لیے اتارا ہے جس میں آگے بڑھنے کی آرزو ہے میں اس کا ہاتھ پکڑنا چاہتا ہوں۔سوال یہ ہے کہ کیا کام کیا جائے اس نے کہا نئے انسان کے لیے کام کرو۔تم وہ ہو جو تم کھاتے ہو۔اگر تم یہ کھانا دوسرے کو دے دو تو اس سے ''انسان'' مضبوط ہوگا۔انسان گدھے والا انسان، انسان کا بچہ اپنے لیے لیتا اور کھاتا ہے۔وہ انسان جسے خدا بنانا چاہتا ہے یہ دوسروں کو دیتا ہے۔انسان تنہا نہیں اجتماع میں منظم ہے۔نظام بناؤ جو بھوکوں کو کھانا کھلائے۔اپنے نفس کو روک کر نوع انسانی کے فائدے کی بات کرتا ہے۔یہ ہے اس کی زندگی یہ نفس کی زندگی نہیں۔نفس قدرت کا عطیہ ہے اس کو بناؤ اور سنوار کر آؤ۔

قل العفو۔۔۔ضرورت سے زیادہ دے دو، ضرورت کا تعین کون کرے گا؟ اپنی ضرورت کا ادراک کر سکتے ہو تم اپنے محاسب اور غاصب خود ہی ہو۔دوسرے کا تقاضا پورا کر دو اور اپنی ضرورت روک دو۔اب میں ایسا انسان بننا چاہتا ہوں۔ اقبال یاد آیا۔

جو حرف قل العفو میں پوشیدہ ہے اب تک اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار

جنگ یرموک کا واقعہ۔۔۔ایک مسلمان بھائی کو پانی پلانے نکلا قریب پہنچا تو ایک صدا آئی، پانی! بھائی نے اشارہ کیا اسے پانی پلاؤ، وہاں پہنچا تو قریب سے آواز آئی پانی! پانی! اُس نے کہا میرے ساتھی کو پانی کی ضرورت ہے۔جب اس کے پاس پہنچا تو وہ جام شہادت نوش کر چکا تھا واپس آیا تو دوسرا بھی، بھاگا بھاگا بھائی کے پاس آیا تو وہ بھی خالق حقیقی سے جاملا۔یہ زندگی کا تصور ہے تینوں نے اپنے تقاضوں پر دوسرے کو ترجیح دی۔یہ ہے وہ انسان کا طرزِ عمل جس کو خدا زندگی کہتا ہے۔

میرا ہاتھ شحِ نفس کی طرف جانے کی کوشش کرتا ہے مگر میں بچتا رہا ہوں۔والد صاحب کی تربیت کام آئی۔واپڈا میں کلرک بھرتی ہوا اس وقت تنخواہ 105 روپے ماہوار تھی اور سونا 90 روپے تولہ تھا۔

میری شادی۔۔۔ہوگئی اور میں نے تنخواہ والدہ کو لا کر دی۔والدہ نے کہا 105 روپے ہم چاروں کی ضرورت سے زائد ہیں۔والدہ نے کہا 75 روپے جو بچ جاتے ہیں اس پر تمہارا حق نہیں۔ضرورت سے زائد یہ تمہاری آزمائش اور تربیت کے لیے ہے۔یہ ان کا حق ہے جن کو براہِ راست نہیں ملا۔وہ تمہارے پاس لینے نہیں آئیں گے۔یہ تمہارا فرض ہے کہ ان تک پہنچاؤ۔ کسی بچے کی فیس ادا نہیں ہوئی، کسی مریض کو علاج اور کسی کو اناج کی ضرورت ہے۔زائد رقم کے نکاس کا انتظام تمہیں خود کرنا ہے

تمہیں دیکھنا پڑے گا۔تم اگر اجتماعی ذمہ داری پوری کرو گے تو شکر ادا ہو جائے گا۔اور اگر شکر ادا کرو گے تو ڈھیروں ملیں گے۔ وہ دن اور آج کا دن زیادہ سے زیادہ دیتے چلے گئے۔دوسروں کے لیے نوعِ انسانی کے لیے دینے والے مستحسن کہا گیا ہے۔

حسن۔۔۔کو اگر انسان کی سطح پر دیکھیں تو اس کا معیار اس کے اندر ہے۔پس منظر معاشرتی ہے۔افریقہ میں حسین وہ جو گہرے کالے رنگ کا ہو۔ہمارے ہاں حسین وہ جو گندمی رنگ کا ہے۔شمالی علاقہ جات میں سفید رنگ حسین کہلاتا ہے۔میں کہتا ہوں۔۔۔حسن تو توازن اور تناسب کا نام ہے۔توازن والے کو حسین کہتے ہیں۔اس کا معیار انسان کے اندر ہے۔یہ پہلو بھی غور طلب ہے۔

جسم ایسا کہ اجنتا کا عمل یاد آئے سنگ مرمر میں ڈھلا تاج محل یاد آئے

پگھلے پگھلے ہوئے رنگوں کی روانی ہو تم

مگر بات ٹھہری پھر بھی توازن پر۔

جس طرف سے بھی نظر ڈالیں سہانی ہو تم

اللہ کے حضور۔۔۔میں تو ہر وقت اس کے حضور ہوتا ہوں۔ہر وقت حساب ہو رہا ہے۔تم اس کی موجودگی کا احساس کرتے ہو یا غفلت میں ہو۔غفلت سے نکل آنا حضوری ہے اور انسان تو ہر آن جوابدہ ہوتا ہے۔ہر وقت حضوری ہے۔اور یہ حضوری شعوری اور سروری بھی ہے۔

جو دم غافل سو دم کافر!

قرآن اور اللہ کی حضوری۔۔۔ہم تمہاری نسبت اس مرنے والے کے زیادہ قریب ہوتے ہیں مگر تمہیں نظر نہیں آتا یہ ہے حضوری۔

مرا تو جو بھی قدم ہے وہ تیری راہ میں ہے جہاں کہیں بھی رہے تُو مری نگاہ میں ہے

والدہ اور والد صاحب نے قرآن جھولی میں رکھ کر پڑھایا۔ہم عربی نہیں جانتے ہم تو ترجمہ پڑھتے ہیں اور یہ ترجمہ دور ملوکیت کا لکھا ہوا ہے۔اساتذہ اور ابا جی نے قرآن سے پیار کرنا سکھایا۔

مولوی کا۔۔۔اہم کردار ہے پاکستان بنانے میں اس نے قرآن کا تعلق آواز سے ٹوٹنے نہیں دیا۔اور یہ قرآن سے پیار ہی تو تھا۔ماں جی، والد نے کہا یہ قرآن اللہ کی آواز ہے۔ترجمہ پڑھیں، تو قرآن اپنی آواز سناتا ہے۔اس کا بھی اجر ہے اور وہ اجر ہے قیامِ پاکستان۔

میرے اولین اساتذہ۔۔۔تو والدین ہیں۔والدہ صاحبہ نے احادیث مجھے پڑھائیں۔ایم اے اسلامیات کا امتحان دیا اور وہ ہی احادیث امتحان میں بھی آ گئیں۔

میرے اساتذہ۔۔۔جامعہ سلفیہ دہلی کے فاضل مولانا عبدالرحمان کے پاس پڑھنے لگا۔اور پھر مولوی احمد دین کی

شاگردی اختیار کی یہ بھی اہلحدیث تھے۔ رواں ترجمہ قرآن پاک کا دیوبندی عالم سے پڑھا۔ قاری عبدالرحمان خاں پانی پتی نے قرآن کا تلفظ سکھایا۔ قرآن کی آواز اور الفاظ کے ساتھ قاری عبدالرحمان خاں نے پیار پیدا کیا۔

والدین۔۔۔ کا زور تھا کہ قرآن سمجھو۔ یہ قرآنی چٹھی۔۔۔ آپ کے نام ہے دوسرے سے پڑھوالو یا خود پڑھنے کی صلاحیت پیدا کرلو۔ مولوی احمد دین نے 13 سال کی عمر میں قرآن پاک کے 25 پارے ترجمہ کے ساتھ ختم کروائے۔ یہ جذبہ مٹنا نہیں چاہیے خدا کے ساتھ وابستگی کا۔ حافظ عبدالعزیز بھی میرے اساتذہ میں شامل ہیں۔ ایک ہستی جن کو میں حکیم مولوی احمد دین کہتا ہوں نے مجھے قرآن مجید کے قریب کیا۔ حکیم مولوی احمد دین نے میری زندگی کی نگرانی اور تربیت کی۔

سکول میں۔۔۔ مولوی شیر محمد چھٹی، ساتویں کلاس میں استاد تھے۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ کے مرید اور شاگرد تھے۔ اس لحاظ سے میں اشرف علی تھانویؒ کا پوتا شاگرد ہوں۔ ان کی پڑھائی ہوئی فقہ کے نتیجے میں ایم اے اسلامیات میں فقہ کا پرچہ پاس کیا۔ مولوی صاحب کلاس میں درس دے رہے تھے کہ اسلام میں یہ ہے۔ میں نے کہا مولوی صاحب آپ ٹھیک نہیں فرمارہے۔ میں نے قرآن کی آیت کا حوالہ دیا۔ مولوی صاحب نے کہا اس پر کل بات کریں گے۔ کہنے لگے میں ساری رات نہیں سوسکا۔ ان کا بیٹا خیر المدارس ملتان سے فارغ التحصیل ہوکر آیا تھا۔ کہنے لگے میں اور میرا بیٹا ساری رات کتابیں کھنگالتے رہے۔ استادمحترم نے صبح ساری کلاس کے سامنے کہا کہ یہ اللہ دتا ٹھیک کہتا تھا اور میں نے غلط کہا تھا۔ اس رویے نے میری بہت تربیت کی۔ اس سے میری زندگی تبدیل ہوگئی کہ حق بات تسلیم کرنے میں ایک لمحہ بھی دیر نہیں کرنی چاہیے۔ فرمایا یا درکھو اگر غلطی سمجھ میں آجائے تو اس کو تسلیم کرلینا۔ ایسا نہ ہو کہ اس غلطی کو اپنے دامن میں لے کر خدا کے سامنے پیش ہونا پڑے۔ آج بھی ان کے لئے دعا کرتا ہوں۔ غلطی سمجھ میں آجائے تو دیر نہیں کرتا اور تائب ہوکر اصلاح کرلیتا ہوں۔

علامہ غلام احمد پرویز۔۔۔ کی کتاب ''معراجِ انسانیت'' سے بہت متاثر ہوا۔ کیوں متاثر ہوا اس کتاب میں حضور پاکؐ کی زندگی سے ان کوششوں کو نمایاں کیا گیا ہے جو قرآن پاک کی تشریح کرتی ہیں۔ قرآن پر عمل کس طرح کیا جاسکتا ہے۔ اب یہ اس کتاب سے آپ کو مل سکتا ہے۔

24 سال کی عمر۔۔۔ میں جنوری 1964ء تا 1965ء ملتان میں درس قرآن دیتا رہا۔ درس میں قرآن کو قرآن سے پیش کرتا۔ 1966ء میں لیہ تبادلہ ہوگیا۔ رات کتاب لے کر ختم کر کے صبح واپس کر دیتا۔ بچپن سے دسویں کلاس تک کورس کی کتب نہیں خرید سکا۔ ساتھیوں کی کتابیں پڑھ کر ہی پاس ہوتا رہا۔ نسیم لیہ شاعر مجھے سرکاری لائبریری میں لے گئے۔ ہم لائبریری میں گھومتے رہے۔ میں نے 5 کتب نکالیں اور کہا یہ میرے لیے نئی ہیں اور باقی تمام کتب میں پڑھ چکا ہوں۔ میں نے کہا کسی کتاب کی پشت پر ہاتھ رکھو۔ میں نے کتاب کا نام اور باب بتادیا۔ دوسری اور تیسری کتب کا بھی موضوع بتادیا۔ نسیم لیہ کے ساتھ چائے پی اور چائے کے دوران وہ نئی 5 کتب بھی پڑھ ڈالیں آدھے گھنٹے میں۔ نسیم لیہ کہنے لگا مجھے بھی یہ راز بتاؤ۔ میں نے کہا۔۔۔ دیباچے کے 20، 25 صفحے ہوتے ہیں ان کو پڑھ لیتا ہوں۔ معاشیات، سیاسیات، نفسیات اور

سوشیالوجی میں نے پڑھی ہے۔ جو کسی مضمون یا موضوع پر تنقید ہوتی ہے اسے پڑھ لیتا ہوں۔ یہ وہ راز اور انداز میرے پڑھنے کا ہے۔

قرآن کے بغیر۔۔۔ اقوام اور افراد کی ترقی نہیں ہوسکتی اور نہ ہی کوئی مقام حاصل ہوسکتا ہے۔ دو پہلو ہیں انسان کا بڑا ہونا، انسان کی چیزوں کا پھیلاؤ اور عروج حاصل کرنا۔ وسائل حیات میں اضافے کو ہم ترقی سمجھتے ہیں۔ ضروریاتِ زندگی کی فراہمی گدھے کی زندگی کا حصہ ہے۔ وہ بہتر ہوجائے گا اس کا چارہ اور نکیل اچھی آجائے گی۔ اس کے مال اور ماحولیات میں اضافے کو ترقی سمجھتے ہیں۔ یہ ترقی ابن آدم کی ہے۔

انسان کیا ہے۔۔۔ انسان تو اس سے اوپر ہے۔ وہ چیزیں جو اس نے بنالی ہیں ان کو استعمال کیسے کرتا ہے۔ نیویارک میں بجلی چلی گئی تو ہزاروں عورتیں ناجائز حاملہ ہوگئیں، یہ ہے چیزوں کی اور مادی ترقی کی مثال۔ انسان ترقی کرے گا تو اس کا کردار بلند ہوگا۔ اردگرد اشیاء کی ترقی نہیں ہوگی تو نفس کی ترقی بھی ممکن نہیں۔ ترقی چاہیے تو۔۔۔ عمل صالح کا لگاؤ اور بہاؤ درکار ہے۔ وسائل بڑھتے رہیں گے ارتقاء ہوتا رہے گا۔ قرآن انسانی سوچ میں بہتری لاتا ہے۔

قرآن میں ہوغوطہ زن اے مردِ مسلماں اللہ کرے تجھ کو عطا جدت کردار

قرآن نے کہا۔۔۔ غلامی نہیں ہوگی اور آج غلامی ختم ہوچکی ہے۔ الٰہی نظریے میں از خود عروج حاصل کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ ہم نمازیں پڑھتے ہیں دن میں 5 مرتبہ۔ ہر نماز میں تیاری سے ادائیگی تک آدھا گھنٹہ صرف ہوتا ہے۔ نماز فحشا اور منکر سے روکتی ہے۔ مگر اسلامی ممالک میں ایسا ہوتا دکھائی نہیں دیتا۔

صلوٰۃ ہے۔۔۔ مسکین کی روٹی اور تعلیم کا مسئلہ حل ہوگا جو ہم نہیں کرتے۔ گویا ہم اس کی تکذیب کرتے ہیں اور روز جزا کو جھٹلاتے ہیں۔ ایک ارب 30 کروڑ مسلمان روزانہ اڑھائی گھنٹے نماز میں صرف کرتے ہیں۔ کیا یہ عمل صالح ہے؟

Be Fitting Action صلوٰۃ یتیموں، غریبوں اور مسکینوں کا مسئلہ حل کرے۔ اگر یہ مسئلہ حل نہیں ہوا تو ہم یہ کام نہیں کررہے۔ نماز کی روح درکار ہے:

نماز و روزہ و قربانی و حج یہ سب باقی ہیں تو باقی نہیں ہے

شادی۔۔۔ والدین کی مرضی سے ماموں زاد سے ہوئی۔ زندگی خوشگوار گزر رہی ہے۔

راز۔۔۔ دونوں ایک دوسرے کو برداشت کرتے ہیں۔

بیوی محبوبہ بن سکتی ہے۔۔۔ محبوبہ کا لفظ آج کل غلط معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ بیوی کا محبوبہ بن جانا ضروری نہیں۔ اشفاق احمد کا کہنا ہے کہ محبوب اس کو کہتے ہیں جس کا بُرا کام بھی اچھا لگے اور یہ ضروری تو نہیں۔

کرنے کا کام۔۔۔ میں چاہتا ہوں کہ کوئی بھی آدمی نیکی اور ثواب سے آگے گزر جائے۔ کوئی بھی کام کرنے لگے تو یہ دیکھ لے کہ یہ کام اللہ کے حکم کے مطابق ہے یا اس کے خلاف۔ اس معیار سے دیکھیں گے تو نوعیت بدل جائے گی۔

حرف ناصح۔۔۔ اگلا مرحلہ تغیرِ نفس کا ہے۔ نفس کو بدلنے کے لیے وہ کریں جو اللہ نے فرمایا اور حضور پاکؐ نے کر دکھایا۔ یہی عقل و شعور کی بات ہے۔

میری خوبی۔۔۔میں ہر کسی کا وہ کام کر دینا چاہتا ہوں جو اللہ کے حکم کے مطابق ہے اس کے خلاف نہیں۔

میری خامی۔۔۔خرگوش کی خامی ہے۔ جو بہت تیز چل سکتا ہے مگر راستے میں سو جاتا ہے۔ میں اس سے مبرا نہیں ہوں۔ آج بھی کچھوے اور خرگوش کی کہانی پڑھتا ہوں۔ یہ کہانی مجھ پر فٹ آتی ہے۔ کچھوے کا مرحلہ ابھی اختیار نہیں کیا۔ بہت کچھ کر سکتا تھا مگر سو جاتا ہوں۔ یہ احساس کرنے کی بات ہے۔ اور نیند کی تیزی اور غلبے کا اکبر الٰہ آبادی نے خوب بیان کیا ہے۔

ہجر ہو یا وصال اے اکبرؔ جاگنا ساری رات مشکل ہے

میری خامی کیا۔۔۔جو کام کرنا چاہتا ہوں وہ اعلیٰ معیار کا کرنا چاہتا ہوں۔ اس لیے اکثر وہ کام ہوتا نہیں۔

منظور احمد رئیس۔۔۔نویں، دسویں جماعت کے استاد تھے۔ فرمایا بیٹا یاد رکھو۔۔۔کوئی نہیں دیکھے گا کہ تم نے کام کتنی دیر میں کیا ہے۔ یہ دیکھے گا کہ تم نے کام کیا کیا ہے۔

عربی کا قاعدہ لکھا ہے جو ابھی چھپا نہیں۔

سروس کا آغاز۔۔۔واپڈا میں جونیئر کلرک بھرتی ہوا۔ مقابلے کا امتحان دے کر سینئر کلرک بن گیا۔

پاپولیشن پلاننگ آفیسر کا امتحان دیا اور منتخب ہوا۔ اس کے بعد PPSC کا امتحان پاس کر کے سیکشن آفیسر لگا۔ 20 ویں سکیل میں بطور سیکرٹری (MD) کوآپ سٹور ریٹائر ہوا۔ میرے آنے سے پہلے۔۔۔کوآپ خسارے میں تھا۔ میں نے پہلے 3 ماہ میں 15 لاکھ منافع کما کر دیا۔

اہم بات۔۔۔والد اور والدہ رحمت بی بی نے تعلیم و تربیت میں اہم کردار ادا کیا۔ حکیم احمد دین نے مجھے غلام احمد پرویزؔ سے متعارف کروایا 1953ء میں۔ 1953ء میں معراجِ انسانیت بستے میں رکھ کر سکول لے جاتا۔ 3 دسمبر 1957ء میں بزم طلوع اسلام کا ممبر بنا۔ جب ڈپٹی سیکرٹری تھا تو اس وقت میاں صاحب وزیر اعلیٰ تھے۔

لوگوں نے کہا۔۔۔شیخ اللہ دتا کو لے آؤ سب کچھ درست ہو جائے گا اور یہ خلافِ اصول و قانون کام نہیں کرتا۔ کسی نے کہا ایسا نہ کرنا تمہارا بھی نقصان ہوگا اور اس کا بھی۔ تم بھی اگر اسے کوئی خلافِ قانون کام کہو گے تو یہ صاف کہہ دے گا چل اوئے چل میں غلط کام نہیں کرتا۔ یہ بات تھی میرے بارے میں۔ چیف سیکرٹری چوہدری صدیق کو بھی اس نے کہہ دیا غلط کام نہیں کرے گا اور درست کام تیزی سے کرے گا۔ اوقاف میں ڈائریکٹر تھا تو محکمے کی آمدنی 13 کروڑ سے 26 کروڑ تک پہنچا دی۔ اس شعر کے احساس سے روح تازہ ہوتی رہی۔

پیا کے دروازے۔۔۔ پر دستک دی اور ساری زندگی اسے محسوس کرتا رہا۔ 10 سال علامہ غلام احمد پرویزؔ کے درس قرآن میں شریک رہا۔

دینِ حق۔۔۔کی جانب علامہ اقبال اور غلام احمد پرویز نے راہنمائی کی۔ علامہ پرویز فرماتے ہیں قرآن دینِ حق کو چلانے کی ہدایت ہے۔ دینِ حق ایک ہے دو نہیں اور ہدایت کے راستے پر چلنے کے لیے دینِ حق سے آگاہی ضروری ہے۔

اور

جس روز دل کی رمز مغنی سمجھ گیا سمجھو تمام مرحلہ ہائے ہنر ہیں طے

خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی
www.azharabbas.com
khawaja.azharabbas@gmail.com

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

ایک جید عالم دین کی خدمت میں چند گذارشات

مجموعی حیثیت سے ہمارے علمائے کرام ''مذہب'' کے داعی ہیں۔ اور اپنی انفرادی اور ذاتی نجات کے طلبگار اور نجات کا دارومدار زیادہ سے زیادہ پرستش کرنے پر موقوف سمجھا جاتا ہے۔ پرستش کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ اس لئے تہجد، نوافل، اعتکاف وغیرہ پر زور دیا جاتا ہے جس قدر مذہب اور پرستش میں اضافہ ہوتا ہے اسی قدر دنیاوی معاملات سے دستبرداری ہوتی جاتی ہے اور قوم زوال وادبار کا شکار ہوتی جاتی ہے۔ رہبانیت صرف جنگلوں اور صحراؤں میں زندگی بسر کرنا ہی نہیں ہوتی بلکہ اسلامی نظام کے بغیر انفرادی نجات طلب کرنا بھی رہبانیت ہی ہوتی ہے۔ ہمارا یہ موجودہ دور اس معاملہ میں بہت خوش نصیب ہے کہ اس دور میں تحریک طلوع اسلام نے دین کی دعوت عام کی۔ مذہب اور دین کے فرق کو خوب خوب نمایاں کیا، جس کی وجہ سے اب ہمارے علماء کرام بھی اس طرف توجہ فرمانے لگے ہیں۔ ہمارے ایک عزیز جو علماء میں بلند پایہ رکھتے ہیں اور سلطان العلماء شمار کئے جاتے ہیں، دین کے تصور سے قدرے متعارف تو ہوئے ہیں، لیکن انہیں چند ذہنی تحفظات Mental Reservations، اب بھی ہیں اور اس بارے میں شرح صدر حاصل نہیں ہوا۔ اس مضمون میں ان کے دو تحفظات کو رفع کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ بعونہ تعالیٰ

تحریک طلوع اسلام کا اصرار ہے کہ تمام انبیاء کرام پر دین کا قائم کرنا فرض تھا (42:12)، اور غیر اسلامی نظام میں زندگی بسر کرنا جرم ہے (6:123) اور قطعی طور پر منع ہے (4:60) اور جو شخص غیر اسلامی نظام میں زندگی بسر کرتا ہے اس کا ٹھکانہ جہنم ہے (4:97) تحریک طلوع اسلام کے اس موقف پر جناب سلطان العلماء نے فرمایا کہ کیا گزشتہ تمام انبیاء کرام ؑ نے دین کا نظام جاری کیا تھا اور کیا انہیں اتنا اقتدار حاصل ہوا تھا کہ جو دین کا نظام جاری کر دیں۔ دوسرا جناب محترم کا یہ سوال تھا کہ خلافت راشدہ کے بعد دین کا نظام منقرض ہو گیا تو ان کی کیا پوزیشن تھی جو باطل نظام میں زندگی بسر کرنے پر راضی ہو گئے تھے ان دو سوالات کے بارے میں ہماری طرف سے چند معروضات پیشِ خدمت عالی کی جاتی ہیں۔

(1) ارشاد حضرت باری تعالیٰ ہے: اِنَّ الَّذِیۡنَ یُحَآدُّوۡنَ اللّٰہَ وَرَسُوۡلَہٗۤ اُولٰٓئِکَ فِی الۡاَذَلِّیۡنَ ﴿۲۰﴾ کَتَبَ اللّٰہُ لَاَغۡلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِیۡ ؕ اِنَّ اللّٰہَ قَوِیٌّ عَزِیۡزٌ ﴿۲۱﴾ (58:20-21) (ترجمہ) جو لوگ اللہ و رسول کے خلاف کرتے ہیں وہ رب سے بے قدر لوگ ہیں۔ اللہ لکھ چکا ہے کہ میں غالب رہوں گا اور میرے رسول، بیشک اللہ زور آور اور زبردست ہے (ترجمہ نور شیخ الہند)

اس آیۃ کریمہ میں اللہ تعالیٰ کی اس سنت کا بیان ہو رہا ہے جو اس نے طے کر رکھی ہے کہ جب کبھی بھی اللہ اور رسول اور

ان کے مخالفوں میں کشمکش ہوگی، تو غلبہ ہمیشہ اللہ اور اس کے رسولوں کو حاصل ہوگا اور مخالفین ہمیشہ ناکام رہیں گے۔ اور آیۃ کریمہ میں ہی اس دعویٰ کی دلیل بھی یہ فرمادی کہ اِنَّ اللّٰہَ لَقَوِیٌّ عَزِیۡزٌ ﴿۷۴﴾ (22:74) یہ اس دعویٰ کی دلیل ہے کہ اللہ اور اس کے رسول ہی کیوں غالب رہیں گے فرمایا کہ اللہ کوئی کمزور اور بے بس نہیں ہے بلکہ وہ قوی اور عزیز ہے۔ وہ جب اپنے بندوں کی طرف اپنا رسول بھیجتا ہے تو وہ رسول اللہ تعالیٰ کا ارسال کردہ نمایندہ ہوتا ہے جو اس کی مخلوق کے پاس اللہ کے احکامات لاتا ہے اگر لوگ اللہ کے احکامات کو تسلیم کر کے اس کا دین قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ انہیں زمین میں اقتدار عنایت فرماتا ہے (24:5) لیکن اگر وہ اللہ تعالیٰ کے احکام سے اعراض کرتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ ان کو اپنا باغی قرار دے کر ان کو صفحہ ارض سے ختم کر دیتا ہے۔

(2) ارشاد عالی ہوتا ہے: وَاَنۡزَلَ مَعَہُمُ الۡکِتٰبَ بِالۡحَقِّ لِیَحۡکُمَ بَیۡنَ النَّاسِ فِیۡمَا اخۡتَلَفُوۡا فِیۡہِ ؕ (213:21) اور ان سب کے ساتھ ایک سچی کتاب اتاری کہ لوگوں میں فیصلہ کریں جس بات میں ان میں اختلاف ہو۔ آیۃ کریمہ کا مراد یہ ہے کہ ان تمام انبیاء کو ضابطہ قوانین دیا جاتا تھا جو حق پر مبنی ہوتا تھا۔ ضابطہ تو ہر مملکت کے پاس ہوتا ہے لیکن وہ حق پر مبنی نہیں ہوتا۔ وہ باطل پر مبنی ہوتا ہے۔ یہ ضابطہ قوانین انبیاء کرام کو اس لئے دیا جاتا تھا کہ لوگ جن معاملات میں اختلاف کرتے تھے تو یہ انبیاء کرام ان کتابوں کے مطابق ان میں فیصلہ کرتے تھے۔ نبی صرف وعظ نہیں کرتا تھا بلکہ وہ اس کتاب کے مطابق فیصلہ کرتا تھا۔ اس کتاب کے مطابق نظام قائم کرتا تھا۔

(3) ارشاد ہوتا ہے فَقَدۡ اٰتَیۡنَاۤ اٰلَ اِبۡرٰہِیۡمَ الۡکِتٰبَ وَالۡحِکۡمَۃَ وَاٰتَیۡنٰہُمۡ مُّلۡکًا عَظِیۡمًا ﴿۵۴﴾ (4:54) (ترجمہ) سو ہم نے ابراہیمؑ کے خاندان میں کتاب اور علم دیا اور ان کو ہم نے ایک بڑی سلطنت دی۔

اس آیۃ کریمہ کے حاشیہ میں مولانا عثمانی تحریر فرماتے ہیں ''کیا یہود حضرت محمد رسول اللہ ﷺ اور ان کے اصحابؓ پر اللہ کے فضل و انعام کو دیکھ کر حسد کرتے ہیں۔ سو یہ تو بالکل بیہودگی ہے۔ کیونکہ ہم نے حضرت ابراہیمؑ کے گھرانے میں کتاب اور علم اور سلطنتِ عظیم عنایت کی تھی۔ پھر یہ یہود آپ کی نبوت اور عزت پر کیسے حسد اور انکار کرتے ہیں۔ اب بھی تو ابراہیمؑ ہی کے گھر میں ہے'' آل ابراہیمؑ کو دیکھئے۔ اس سے پیشتر وہ خدا کے بتائے ہوئے طریقے پہ چلے خدا کی طرف سے ان کو ضوابط قوانین، کتاب، حکومت، عقل و دانش ملی۔ اور اس کے ساتھ بہت بڑی مملکت بھی ملی۔ یہ وہ انعامات ہیں جو اللہ تعالیٰ گنواتا ہے یہ سب انعامات دین قائم کرنے اور اس پر عمل کرنے کی وجہ سے ان کو ملے تھے۔

(4) ارشاد ہوتا ہے قَالَ عِیۡسَی ابۡنُ مَرۡیَمَ لِلۡحَوَارِیّٖنَ مَنۡ اَنۡصَارِیۡۤ اِلَی اللّٰہِ ؕ قَالَ الۡحَوَارِیُّوۡنَ نَحۡنُ اَنۡصَارُ اللّٰہِ فَاٰمَنَتۡ طَّآئِفَۃٌ مِّنۡۢ بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ وَ کَفَرَتۡ طَّآئِفَۃٌ ۚ فَاَیَّدۡنَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا عَلٰی عَدُوِّہِمۡ فَاَصۡبَحُوۡا ظٰہِرِیۡنَ ﴿۱۴﴾ (61:14) (مفہوم) عیسیٰؑ ابن مریم نے بھی اپنے مخلص رفقاء سے یہی کہا تھا کہ تم بتاؤ کہ تم میں سے کون ہے جو نظام خداوندی کے قیام میں میرا معاون و مددگار بنتا ہے اس کے جواب میں انہوں نے بیک زبان کہا تھا کہ ہم اس مقصد کے

لئے خدا کے رفیق اور مددگار بنتے ہیں۔ ان کی ان کوششوں کا نتیجہ تھا کہ بنی اسرائیل کا ایک گروہ اس نظام کی صداقت پر ایمان لے آیا۔ لیکن دوسرا گروہ اس کا مخالف ہو گیا۔ ہم نے ان لوگوں کو جو دین پر ایمان لائے تھے ان کے دشمنوں کے خلاف مدد دی اور وہ (عیسیٰؑ) کے ساتھی ان پر غالب آ گئے۔

(5) ارشاد عالی ہے: وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ (63:8) عزت اور غلبہ سب کا سب نظام خداوندی کے ساتھ وابستگی میں ہے اس لئے وہ مومنین کے ساتھ مختص ہے لیکن یہ منافقین اس حقیقت کو نہیں سمجھتے۔

(6) ارشاد عالی ہے: اَلَّذِيْنَ يَتَرَبَّصُوْنَ بِكُمْ ۚ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ فَتْحٌ مِّنَ اللّٰهِ قَالُوْٓا اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ۖ وَاِنْ كَانَ لِلْكٰفِرِيْنَ نَصِيْبٌ ۙ قَالُوْٓا اَلَمْ نَسْتَحْوِذْ عَلَيْكُمْ وَنَمْنَعْكُمْ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۭ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا ۝ (4:114) (ترجمہ) منافقین وہ ہیں جو ہمیشہ منتظر رہتے ہیں اور تمہارے نگران رہتے ہیں اگر تو تمہیں فتح و کامیابی نصیب ہو تو کہتے ہیں کہ کیا ہم تمہارے ساتھ نہیں تھے (لہٰذا ہم مال غنیمت میں تمہارے شریک ہیں) اور اگر کفار کامیاب ہو جائیں تو انہیں کہتے ہیں کہ کیا ہم نے تمہیں جنگ اور مومنین کے سامنے سر تسلیم خم نہ کرنے کی ترغیب نہیں دی تھی۔ (لہٰذا ہم تمہارے ساتھ اس کامیابی میں شریک ہیں) خدا تمہارے درمیان قیامت کے دن فیصلہ کر دے گا اور اس نے ہرگز مؤمنوں پر کافروں کے غلبے کی راہ نہیں بنائی۔

لہٰذا آیۃ کریمہ سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ نہ صرف منطق و استدلال سے بلکہ سیاسی، فوجی، ثقافتی، اقتصادی، سیاسی غرضیکہ کسی لحاظ سے بھی کفار اہل ایمان پر غالب نہیں آ سکتے۔

قیامۃ کے لفظ کے متعلق امام راغب نے تحریر فرمایا ہے کہ قیامۃ کے معنے انسان کے یکبارگی کھڑے ہونے کے ہیں اور قیامۃ کے یکبار وقوع پذیر ہونے پر تنبیہ کرنے کے لئے لفظ قیام کے آخر میں 'ۃ' کا اضافہ کیا گیا ہے۔

اس دنیا میں قیامۃ کسی قوم کی نشاۃ ثانیہ ہے جو انقلاب کی رو سے ظہور میں آئے۔ یعنی وہ قوم یکبارگی کھڑی ہو جائیگی۔ اور مرنے کے بعد دوسری زندگی تو ایک انقلابی ظہور ہے۔ ہی قیامۃ، آخرت، ساعت، قرآن کریم کی اصطلاحات ہیں جن کا مفہوم بغور دیکھنا چاہیے کہ اس کی مراد آخروی زندگی سے ہے یا موجودہ زندگی سے شاہ ولی اللہ صاحب نے اپنی شاہکار حجۃ اللہ البالغہ میں تحریر فرمایا ہے ''زبان شریعت میں حشر کے دو معنے ہیں۔ ایک ملک شام میں لوگوں کا جمع ہونا۔ قیامت کے پیشتر یہ واقعہ اس وقت ہوگا جب زمین پر لوگوں کی قلت ہو جائیگی۔ تو بعض لوگ مختلف تقریبوں کیوجہ سے اور بعض لوگ آگ (جنگ) کیوجہ سے وہاں جمع ہوں گے۔ دوسرے حشر کے معنے ہیں موت کے بعد اکٹھا ہونا''۔ اسی طرح قیامۃ کا لفظ بھی اس دنیا میں قیام اور لوگوں کے قیام کے لئے بولا جائے گا۔''

مومنین کو آگاہ کرنے کے لیئے ارشاد عالی ہے کہ ان مخالفین کی حالت یہ ہے کہ تمہارے متعلق ہمیشہ انتظار میں رہتے

ہیں۔ اگر بفضلِ ایزدی تمہاری فتح ہوگی تو یہ جھٹ سے کہہ دیتے ہیں کہ ہم تو تمہارے ساتھ ہیں اور اگر فریق مخالف کے حصہ میں کامیابی آجائے تو یہ ان سے جا کہیں گے کہ یہ سب ہمارے طفیل ہے، ہم نے ہی تمہیں ترغیب دلا کر مسلمانوں پر حملہ کے لئے آمادہ کیا تھا۔ ہم نے ہی تمہاری ہمت بڑھائی تھی اور ہم نے ہی جماعت مومنین سے تمہاری حفاظت کی تھی۔ ان سے کہ دو کہ یہ دورخی چالیں کب تک چل سکتی ہیں عنقریب وہ آخری انقلاب آنے والا ہے (جب مخالف اور موافق جماعتیں نکھر کے ایک دوسرے کے خلاف کھڑی ہو جائیں گی) اس وقت تمہارے متعلق کھلا کھلا فیصلہ ہو جائے گا کہ تم کس کے ساتھ ہو۔ تم کچھ بھی کرلو۔ یہ کبھی نہیں ہوگا کہ خدا کفار کو مومنین پر غالب کردے۔

آپ غور فرمائیں کہ یہ آیت کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا ہے۔ یہ ٹکڑا صرف چند الفاظ پر مشتمل ہے۔ لیکن یہ چند الفاظ معیار اور میزان ہیں یہ جاننے کے لئے کہ واقعی یہ قوم مومن ہے یا مومن نہیں ہے معیار یہ نہیں ہے جو قیامت کے دن جا کر معلوم ہو۔ معیار یہ ہے جو آج معلوم ہو اور ہر شخص کو اس کا علم ہو۔ ٹھیک ہے کہ اگر معیار سامنے آجائے تو پھر تو انسان کسی دھوکے میں نہیں رہتا۔ غور فرمالیں کہ وہ معیار کیا ہے معیار یہ ہے: وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا ﴿۱۴۱﴾ (4:141) یہ ہو نہیں سکتا کہ دنیا میں غیر مسلم مسلمانوں پر غالب آجائیں۔ اب آپ خود فیصلہ کر لیجئے کہ آج کے ایک ارب سے زائد مسلمان کس شق میں شمار ہوتے ہیں۔ الفاظ یہ ہیں کہ کبھی یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ خدا ایسا کرے گا ہی نہیں، بالکل اس بات کی گنجائش ہی نہیں۔ آیت نے ہمیں ایسا پکڑا ہے کہ یہ کوئی نظری بات رہتی ہی نہیں وہ کوئی اعتقادی بات بیان نہیں کر رہا ہے۔ یہ ایک محسوس مرئی اور واقعی شے ہے۔ قرآن کریم نے جو فرمایا تھا يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ (4:136) اے وہ لوگوں جو اپنے آپ کو یہ سمجھ کر دھوکہ میں رکھ رہے ہو کہ ہم مسلمان ہیں، مومن ہیں تم ایمان لاؤ، پہچان یہ ہے کہ یہ سوچ نہیں سکتا کہ غلط نظام حیات رکھنے والی قوم، قرآن کریم کے نظریہ زندگی پر ایمان لانے والی قوم پر غالب آجائے یہ ہو نہیں سکتا۔ یہ صرف اس وقت ہو سکتا ہے کہ جب مسلمان قرآن کے نظریہ حیات کو چھوڑ کر اسے مذہب کی صورت میں تبدیل کر دیں۔ حضرت اقدس مولانا عثمانی نے حواشی میں اس آیت کے ذیل میں جو کچھ فرمایا ہے، ساتھ ساتھ وہ بھی ملاحظہ فرمالیں۔ فرماتے ہیں ''یعنی اللہ تعالیٰ تم میں اور ان میں حکم فیصل فرما رہے ہیں کہ تم کو جنت دے گا اور ان کو جہنم میں ڈالے گا۔ دنیا میں جو کچھ ان سے ہو سکے کر کے دیکھ لیں مگر اہل ایمان کی بیخ کنی ہرگز نہ کر سکیں گے جو ان کی دلی تمنا ہے'' مفتی اعظم پاکستان مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے تحریر فرمایا ''سو (منافق دنیا میں گو اظہار اسلام کی برکت سے مسلمانوں کی طرح زندگی بسر کر رہے ہیں لیکن) اللہ تعالیٰ تمہارا اور ان کا قیامت میں (عملی) فیصلہ فرما دیں گے اور اس فیصلہ کے ذریعہ ہرگز اللہ تعالیٰ کافروں کو مسلمانوں کے مقابلہ میں غالب نہ فرمائیں گے۔ بلکہ کفار مجرم قرار پا کر دوزخ میں جائیں گے اور مسلمان اہل حق ثابت ہو کر جنت میں جائیں گے اور فیصلہ عملی یہی ہے'' اور اس طرح حضرت اقدس نے دنیا میں مسلمانوں کے زوال و ادبار کا جواز خود قرآن سے فراہم فرما دیا اور غیر مسلم ان کے ہمیشہ شکر گزار رہیں گے۔

مشہور تفسیر ضیاء القرآن کے مصنف ارشاد فرماتے ہیں کہ ''بعض علماء نے 'سبیل' سے مراد دلیل لی ہے یعنی دلیل و برہان کے میدان میں کافر کبھی مسلمانوں کو شکست نہیں دے سکتے جلالین میں بھی لکھا ہے:

اللہ تعالیٰ قیامت کے دن تمہارے اور ان کے مابین فیصلہ کر دے گا کہ تم کو جنت میں داخل کرے گا اور ان کو جہنم میں داخل کرے گا (بحوالہ فصل الخطاب)

حضورؐ کے متعلق تو قرآن کریم میں تین تین مقامات پر 9:33، 48:28، 64:9 ارشاد ہے کہ اسلام کا نظام دنیا کے ہر نظام پر غالب آئے گا، حضورؐ کے عہد میں یہ نظام کس طرح متشکل ہوا اسے سورہ فتح کی آیات (29-4:28) میں بڑے دلکش انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اس جماعت کو جس کے ہاتھوں یہ نظام قائم ہوا تھا، کہیں امت مسلمہ کہا کہیں جماعت مومنین، اور کہیں حزب اللہ کہہ کر پکارا گیا ہے۔ اور واضح الفاظ میں کہا گیا ہے کہ ان پر کوئی قوم غالب نہیں آ سکے گی۔

یہ بات بھی پیش نظر رکھیں کہ جن آیات میں مسلمانوں کے غلبہ و اقتدار کا ذکر کیا گیا ہے اسے اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ ﴿۱۳۹﴾ (3:139) سے مشروط کیا گیا ہے یعنی مسلمانوں کا غلبہ اس قت تک قائم و باقی رہے گا جب تک مسلمان اس نظام کو باقی رکھیں گے۔ اگر تم نے اس نظام کو چھوڑ دیا تو تم بھی دنیا کی باقی قوموں کی طرح ایک قوم بن جاؤ گے، جن کا صرف نام ''مسلمان'' رہ جائے گا۔

یہ تمام معروضات اس لئے پیش خدمت عالی کی گئی ہیں تا کہ یہ بات واضح ہو جائے کہ رسول یا مؤمنین مغلوب نہیں ہو سکتے۔ حضور ﷺ سے پیشتر جتنے انبیاء کرام تشریف لائے ان میں سے اکثر نے غلبہ و اقتدار حاصل کر کے اسلامی نظام قائم فرمایا تھا۔ البتہ بعض انبیاء کے ساتھ ایسا ہو سکتا ہے کہ وہ اس جدوجہد کے دوران ہی وفات پا گئے ہوں۔ خود حضور ﷺ کے متعلق ارشاد ہے: وَاِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعۡضَ الَّذِىۡ نَعِدُهُمۡ اَوۡ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِلَيۡنَا مَرۡجِعُهُمۡ ثُمَّ اللّٰهُ شَهِيۡدٌ عَلٰى مَا يَفۡعَلُوۡنَ ﴿۴۶﴾ (10:46) (ترجمہ) اور اگر ہم کچھ سزائیں کہ جن کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے (تیری زندگی میں) تجھے دکھائیں (یا قبل اسی کے کہ وہ عذاب میں گرفتار ہوں) تجھے دنیا سے لے جائیں۔ بہرحال ان کی بازگشت ہماری طرف ہے، اس کے بعد خدا اس پر گواہ ہے جو کچھ وہ انجام دیتے ہیں۔ اس آیت میں حضور ﷺ کی تسلیٔ خاطر کے لئے ارشاد ہوا ہے کہ جن سزاؤں کا ہم نے ان سے وعدہ کیا ہے۔ اگر ان کا کچھ حصہ ہم تجھے دکھائیں اور اپنی زندگی کے دوران اگر تو ان کے عذاب اور سزا کو دیکھ لے اور یا پھر اس سے قبل کہ وہ ایسے انجام سے دوچار ہوں ہم تجھے دنیا سے لے جائیں۔ بہرحال ان کی بازگشت ہماری طرف ہے اور خدا ان کے انجام دئے ہوئے اعمال پر شاہد ہے۔ یہ آیت حضور ﷺ سمیت تمام انبیاء کرام کے بارے میں اور تمام امتوں کے بارے میں ہے۔ اس میں ایک کلی قانون بتایا گیا ہے۔ اس آیت کے ذیل میں مولانا عثمانی نے تحریر فرمایا ''یعنی ہم نے کفار کو عذاب دینے اور اسلام کو غالب و منصور کرنے کے جو وعدے کیے ہیں خواہ ان میں سے بعض وعدے کسی حد تک آپ ﷺ کی موجودگی میں پورے کر کے دکھلائے جائیں جیسے بدر وغیرہ میں دکھلایا۔ یا آپ کی وفات ہو جائے اس لئے آپ کے سامنے ان میں سے بعض کا ظہور نہ ہو۔ بہرصورت یہ یقینی ہے کہ وہ سب پورے ہو کر رہیں گے۔''

قرآن کریم کی یہ وضاحتیں اور دعاوی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ گزشتہ انبیاء کرام نے غلبہ حاصل کر کے دین قائم فرمایا تھا۔اس بات کی تصدیق سورہ شوریٰ کی آیۃ کریمہ شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ۭ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ ۭ اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَاۗءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ ۱۳ (42:13) سے بھی ہوتی ہے کہ تمام انبیاء کرام نے اپنے اپنے وقت میں اپنی اپنی امت میں دین قائم فرمایا تھا کیونکہ ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا قیام کا حکم دیا گیا تھا اور ان کا مقصدِ بعثت ہی دین کا قیام ہوتا تھا۔

دوسرا سوال جس کو اکثر احباب پیش کرتے ہیں یہ تھا کہ جب غیر اسلامی مملکت میں زندگی بسر کرنا جرم ہے اور جو شخص بھی غیر اسلامی نظام میں زندگی بسر کرتا ہے وہ جہنمی ہے (4:97) یہ بڑی دکھتی رگ ہوتی ہے اور مسلمانوں کی کشتی ایک ہزار سال سے اس بھنور میں پھنسی ہوئی لکڑی کی طرح ہے کہ اس کی گردش تو رات دن اتنی تیز ہو رہی ہوتی ہے۔مگر ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھتی۔ہم مسلمانوں میں بھی یہی بحثیں اسی نکتہ پر ہوتی ہیں کہ فلاں بزرگ جو گزر گئے ہیں ان میں کون افضل تھا اور کون مفضول تھا۔پھر یہ اکساتے بھی اسی طرح سے ہیں کہ دیکھو تمہارے بزرگ کی شان میں یہ کیا کہتا ہے۔یہی تو تدبیر و حکمت تھی جو فرعون نے استعمال کی تھی۔اسے یہ معلوم تھا کہ دربار کے سارے اراکین بت پرست ہیں، خود فرعون اور اس کے حواری اس کے وزراء سب بت پرست تھے اسے معلوم تھا کہ حضرت موسیٰؑ کے جواب پر وہ سب بھڑک اٹھیں گے لہٰذا اس نے اس چال کے تحت ان سے پوچھا کہو موسیٰ ان کا کیا حال ہے: قَالَ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ فِيْ كِتٰبٍ ۚ (20:52) موسیٰؑ نے کہا اس بات کا مجھے علم نہیں کہ وہ لوگ کس حال میں ہیں کہا کہ ان کی خبر میرے رب کے پاس لکھی ہوئی ہے۔(ترجمہ حضرت شیخ الہند) ان کا فیصلہ قانون خداوندی کے مطابق ہو جائیگا۔اس لئے ان کا یہ معاملہ میرے خدا کے پاس ہے۔لیکن اتنا ضرور ور یاد رکھو کہ وہ خدا ایسا نہیں کہ وہ کوئی چیز بھول جائے یا غلطی کر جائے۔اصل جواب اس کا یہی ہے جو حضرت موسیٰؑ نے دیا تھا۔

اب اس باب میں قرآن کریم کی نے فرمایا: اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَاۗءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ ۙ (2:133) کیا تمہیں معلوم ہے جب یعقوب مرنے والے تھے تو انہوں نے اپنے بیٹوں سے کیا پوچھا تھا۔انہوں نے پوچھا تھا کہ: مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِيْ ۭ (2:133) میرے مرنے کے بعد تم کس کی محکومیت اختیار کرو گے۔قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَاۗىِٕكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ (2:133) ان سب نے کہا اسی صاحب اقتدار کی جس کی محکومیت ہمارے دادا ابراہیمؑ نے اختیار کی، اسمٰعیلؑ و اسحٰقؑ نے کی ہم بھی اس کی محکومیت اختیار کریں گے۔جس کی محکومیت ہم اختیار کریں گے وہ ''اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ'' ہی تو ہے۔وہ ایک ہی تو ہے جس کی محکومیت اختیار کرنی ہے' ونحن لہ مسلمون' بس ہم تو اس سامنے جھکیں گے۔اس سے آگے قرآن کریم فرماتا ہے تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْـَٔـلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۱۳۴ (2:134) فرمایا یہ اسلاف، یہ لوگ جو اپنے اپنے وقت میں اپنے اپنے اعمال کے ساتھ

دنیا سے چلے گئے جو کچھ انہوں نے کیا وہ ان کے لئے تھا جو کچھ تم کرو گے وہ تمہارے لئے ہوگا۔ اور تم سے ہم یہ پوچھیں گے ہی نہیں کہ انہوں نے کیا کیا تھا۔ سوال یہ ہے کہ تمہارے سامنے زندگی کا یہ ضابطہ حیات ہے۔ تم نے اس کے مطابق نظام قائم کر کے، اس کے مطابق زندگی بسر کی یا نہیں۔ قرآن کریم کی یہ ایک آیت مسلمانوں کو کتنی بڑی کشمکش سے نکال کر بلند مرتبہ پر لے جاتی ہے۔ اس ایک آیت سے ہماری جو توانائیاں بچ جاتی ہیں، جو اس قسم کے مباحث میں ضائع ہو جاتی ہیں، اور انسانوں کو وہ مقام عطا کرتی ہے کہ ہر شخص اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے اور اسی کے مطابق درجہ و رتبہ پائے گا۔

آپ نے قرآن کریم کا جواب ملاحظہ فرمالیں جو واضح بھی ہے اور مسکت بھی۔ اور قرآن کریم کے اس واضح بیان کے بعد تاریخی جواب کی کوئی اہمیت نہیں رہتی۔ لیکن چونکہ ہمارے علمائے کرام تاریخ کو قرآن سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں اس لئے ان کے سامنے یہ عرض ہے کہ جس تاریخ کا وہ سہارا لیتے ہیں وہ تاریخ ہی مشکوک اور ناقابل بھروسہ ہے۔ قرآن کریم نے ارشاد فرمایا کہ حضور ﷺ کے ساتھی رُحَمَآءُ بَیۡنَہُمۡ (48:29) آپس میں نرم دل ہیں، فَاَلَّفَ بَیۡنَ قُلُوۡبِکُمۡ فَاَصۡبَحۡتُمۡ بِنِعۡمَتِہٖۤ اِخۡوَانًا ۚ (3:103) پھر تمہارے دلوں میں الفت دی اور اب اس کے فضل سے بھائی بھائی ہو گئے یہ تو حضور کے ساتھیوں کے متعلق تھا لیکن قرآن نے اس کے علاوہ ایک اصولی بات بھی ارشاد فرمائی: اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَیَجۡعَلُ لَہُمُ الرَّحۡمٰنُ وُدًّا ﴿۹۶﴾ (19:96) بیشک جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال کئے اللہ ان میں محبت پیدا کر دے گا۔ یہ عام مومنین کا ذکر ہے۔ حضور ﷺ کے ساتھیوں کی شان تو اس سے بلند و ارفع تھی۔

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ قرآن کریم نے صحابی کا لفظ کسی جگہ بھی استعمال نہیں کیا۔ بلکہ قرآن نے ''وَالَّذِیۡنَ مَعَہٗۤ'' (48:29) کے الفاظ (وہ لوگ جو اس کے ساتھ ہیں) استعمال فرمائے ہیں (48:29) ان الفاظ کا مفہوم آپ کے پاس بیٹھنا اور آپ سے جسمانی مصاحبت نہیں ہے کیونکہ ایسی مصاحبت تو منافقین بھی رکھتے تھے۔ بلکہ 'معہٗ' سے مراد وہ لوگ ہیں جو حضور کا دین قائم کرتے ہیں۔ ہمارے اس موقف کی تائید 'تفسیر مظہری' نے بھی کی ہے۔ وَالَّذِیۡنَ اتَّبَعُوۡہُمۡ بِاِحۡسَانٍ ۙ (9:100) اور (بقیہ امت میں) جتنے لوگ اخلاص کے ساتھ ان کے پیرو ہیں۔ بعض علماء کا قول ہے کہ ان سے 'سابقین اولین' کے علاوہ دوسرے انصار و مہاجر مراد ہیں۔ بعض نے کہا کہ قیامت تک جتنے لوگ سابقین اولین کی راہ پر چلنے والے ہوں گے۔ یعنی ایمان میں، ہجرت میں اور رسولؐ کے دین کی مدد کرنے میں جو سابقین کے نقش قدم پر چلیں گے وہ سب مراد ہیں۔

توجہ فرمائیے

ادارہ طلوع اسلام لاہور اکتوبر کے تیسرے ہفتے میں سالانہ کنونشن کا انعقاد کر رہا ہے۔ احباب سے گذارش ہے کہ اپنے اپنے علاقہ کی بزم ہائے طلوع اسلام سے رابطہ کر لیں۔ (چیئرمین ادارہ)

اَلْحَمْد سے وَالنَّاس تک

مسلسل قرآنِ کریم کے سمجھنے اور سمجھانے کا بالکل نیا انداز

مفہوم القرآن

(پرویز)

یہ نہ قرآنِ کریم کا ترجمہ ہے، نہ تفسیر بلکہ اِس کا مفہوم ایسے واضح، مسلسل، مربوط اور دِلکش انداز میں پیش کیا گیا ہے جس سے قرآنی مطالب تابندہ ستاروں کی طرح نگہِ بصیرت کے سامنے اُبھر کر آجاتے ہیں۔

نیا اور کمپیوٹر کمپوز ڈ ایڈیشن شائع ہو گیا ہے۔

کمپیوٹر کمپوزنگ اور کتابت کا حسین اِمتزاج

طباعت کا اعلیٰ ترین معیار

طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ) 25 بی، گلبرگ 2، لاہور

tolueislam@gmail.com ; www.islamicdawn.com

www.facebook.com/tolueislam.trust

Phone: +92 42 35753666

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

بچوں کا صفحہ

نئے پڑوسی

نثار صاحب اور سرمد صاحب ایک دوسرے کے پڑوسی تھے۔ دونوں ایک ہی مکان کے دو حصوں میں رہتے تھے۔ اِن کا آپس میں سلوک اتنا اچھا تھا کہ لوگ انہیں دیکھ کر کہتے تھے کہ یہ کتنے اچھے پڑوسی ہیں۔

سرمد صاحب کے گھر اگر زیادہ مہمان آجاتے تو نثار صاحب کی بیوی آ کر کھانا پکانے میں مدد کر دیتی۔ نثار صاحب کی چھوٹی بیٹی کبھی اپنی امی یا ابو سے ناراض ہوتی تو سیدھا سرمد صاحب کے گھر آتی اور آتے ہی اپنی توتلی زبان میں کہتی:

''چاچی، چاچی! میں آپ تی بیٹی ہوں۔ میں امی تے گھل نہیں جاؤں گی۔''

یہ دو گھرانے ہنسی خوشی زندگی گزار رہے تھے۔ دو تین سال یوں ہی گزر گئے پھر نثار صاحب کا تبادلہ کراچی ہو گیا۔ سرمد صاحب، ان کی بیگم اور بچوں کو بہت افسوس ہوا۔

نثار صاحب کے مکان میں نئے کرایہ دار آ گئے۔۔۔ یہ تھے اکمل صاحب۔۔۔ ایک وہ۔۔۔ ایک ان کی بیوی اور ایک بچی۔۔۔!

سرمد صاحب اپنی بیوی کے ساتھ نئے پڑوسیوں سے ملنے گئے مگر وہ لوگ بڑے لاپروا ہو کر ملے۔ سرمد صاحب کی بیگم نے گھر آ کر سرمد صاحب سے یہ بات کہی لیکن ان کا دل بہت بڑا تھا۔ بولے:

''بھئی ممکن ہے کہ وہ لوگ کسی وجہ سے پریشان ہوں۔۔۔ ویسے بھی یہ تو ہمارا فرض تھا۔۔۔ ہر آدمی کو اپنا کام کرنا چاہیے۔ دوسرا کیا کرتا ہے ہمیں اس سے کیا۔''

دن گزرتے چلے گئے۔ اکمل صاحب یا ان کی بیگم ایک بار بھی سرمد صاحب کے گھر نہ آئے۔ سرمد صاحب ہی راہ چلتے اکمل صاحب کو سلام کر لیتے مگر اکمل صاحب نے کبھی پہل نہ کی۔۔۔ بھلا ایسی باتوں کا اثر کب تک نہ ہوتا۔ سرمد صاحب اور ان کی بیوی نے بھی اپنے نئے پڑوسیوں سے بات کرنی چھوڑ دی۔

رمضان شریف کا مہینہ آیا۔ یہ مہینہ برکتوں اور رحمتوں کا مہینہ ہوتا ہے۔ اس سے بڑی برکت اور کیا ہوگی کہ اللہ تعالیٰ نے اسی مہینے میں اپنی آخری کتاب ''قرآن مجید'' ہمارے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اتارنی شروع کی تھی۔

ایک دن عصر کی نماز کے بعد سرمد صاحب قرآن مجید پڑھ رہے تھے تو دیکھا کہ یہ حکم تھا:

''اپنے والدین کے ساتھ اچھی طرح پیش آؤ، اور اپنے پڑوسیوں کے ساتھ چاہے وہ رشتہ دار ہوں یا اجنبی۔''

سرمد صاحب سوچنے لگے کہ میں اپنے پڑوسیوں کے رنگ ڈھنگ سے ایسا تنگ آیا کہ قرآن شریف کا یہ حکم بھی بھول گیا۔ اپنی بیگم کو فوراً آواز دی اور کہا:

''آج افطاری کے لیے جو کچھ پکایا ہے اور بازار سے جو پھل آئے ہیں ان میں سے کچھ اکمل صاحب کے گھر بھی بھیج دو۔''

بیگم سرمد نے دو تین تھالیوں میں سب چیزیں رکھ کر اکمل صاحب کے گھر بھیج دیں۔ وہ لوگ بھی روزہ کھولنے کی تیاری کر رہے تھے۔ اس بات کا ان کے دل پر اثر ہوا اور سوچنے لگے کہ اگر عبادت سے دل نہ بدلیں اور ہم زیادہ اچھے مسلمان اور انسان نہ بنیں تو ایسی عبادتوں کا کیا فائدہ۔

یہ سوچ کر وہ شرمندہ ہوئے اور دوسرے دن صبح ہی صبح اکمل صاحب نے سرمد صاحب سے کہا:

''بھائی صاحب! آج آپ اور بھابھی ہمارے گھر روزہ افطار کریں اور ہاں! اپنے بیٹے اور بیٹی کو ضرور ساتھ لانا۔''

اس دن سے ان دونوں گھرانوں کا آپس میں ملنا بڑھ گیا۔ قرآن مجید کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے نے دو گھرانوں کے تعلقات کو کیسا اچھا بنا دیا۔ اگر ہم قرآن مجید کی سب باتوں پر چلنے لگیں تو زندگی کیسی پیاری پیاری ہو جائے گی۔

راستے کی خطرناک گھاٹیاں

راستے کی خطرناک گھاٹیوں سے آگاہ کرتے ہوئے مفکرِ قرآن نے کہا: لیکن عزیزانِ من! اس سفر میں ایک گھاٹی ایسی بھی آتی ہے۔ جہاں کوئی باہر کا رہزن، ڈاکہ زنی نہیں کرتا۔ خود اپنے اندر کا چور کمین میں چھپا ہوا ہوتا ہے۔ یہ گھاٹی ایسی ہے جہاں سے پاؤں پھسلے تو انسان سیدھا جہنم کے عمیق غاروں میں جا گرتا ہے اور وہ گھاٹی یہ ہے کہ آپ اس سلسلہ میں جو کچھ کریں اس میں کسی دنیاوی اجر و معاوضہ کا خیال تو ایک طرف، نمود و نمائش کا شائبہ تک بھی نہ آنے پائے، کہ یہ وہ شرک کی چنگاری ہے جو سب متاعِ عمل کو جلا کر خاکستر بنا دیتی ہے۔ قرآنِ کریم نے اس عظیم حقیقت کو بڑے بصیرت افروز انداز سے بیان کیا ہے جب کہا ہے کہ: اِنۡ اَحۡسَنۡتُمۡ اَحۡسَنۡتُمۡ لِاَنۡفُسِکُمۡ ۟ (17:7) تم کوئی اچھا کام کرتے ہو تو وہ کسی دوسرے کے لئے نہیں، بلکہ خود تمہاری بھلائی کے لئے ہوتا ہے۔ وَمَا تُنۡفِقُوۡا مِنۡ خَیۡرٍ فَلِاَنۡفُسِکُمۡ ؕ (2:272)۔ جو کچھ تم بظاہر دوسروں کو دیتے ہو وہ درحقیقت خود اپنے آپ کو دیتے ہو۔ اب آپ سوچئے کہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ تم ایک مکان اپنے لئے بناؤ اور اس کا احسان اہل مکہ کے سر دھرو۔ تم کھانا خود کھاؤ اور اس کے شکریہ کے متمنی اپنے دوست سے ہو۔ یہی کیفیت اس ___ کام کی ہے جسے آپ قرآنی تحریک کے لئے کرتے ہیں۔ خواہ وہ مالی خدمت ہو یا صرف محنت، یا ایثارِ وقت۔ اگر آپ یہ سمجھ لیں کہ یہ سب کچھ آپ اپنے لیے کرتے ہیں تو پھر آپ کے دل میں کسی اجر و معاوضہ کی تمنا یا صلہ و ستائش کی آرزو پیدا نہیں ہوگی۔ لیکن اگر اس سے آپ کے دل میں اس قسم کا کوئی جذبہ بیدار ہوتا ہے تو سمجھ لیجئے کہ وہ ابلیس کا افسوں ہے جس سے وہ آپ کے اعمال کو رائیگاں بنا رہا ہے۔ انسان تو ایک طرف، قرآنی ذہنیت تو اپنے خدا سے بھی یہ کہتی ہے کہ ؎

شانِ عطا کو تیری عطا کی خبر نہ ہو
یوں بھیک دے کہ دستِ گدا کو خبر نہ ہو!

(پرویزؒ، سالانہ کنونشن، 9 تا 12 نومبر 1967ء)

ڈاکٹر محمد راحیل اکبر

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

نوعِ انسانی امتِ واحدہ .....ایک قرآنی تصور

All Humans as One Nation, The Quranic Concept

تخلیقِ آدم اور فرشتے:

جب زندگی اپنے ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی پیکرِ انسانی میں پہنچی اور مشیت کے پروگرام کے مطابق وہ وقت آیا کہ انسان، اپنے سے پہلی آبادیوں کی جگہ زمین میں آباد ہو۔ تو کائناتی قوتوں کو اس پر تعجب ہوا۔ اس لیے کہ اس سے پہلے کائنات میں کوئی ایسی مخلوق نہیں تھی جسے قوانینِ خداوندی میں مجال سرتابی ہو۔ لیکن اس جدید مخلوق کو صاحبِ اختیار وارادہ بنایا جارہا تھا، جس کا مطلب یہ تھا کہ یہ قوانینِ خداوندی کی خلاف ورزی بھی کرسکتا تھا۔ چنانچہ فرشتوں نے عرض کیا کہ بارالٰہا! یہ کس قسم کی مخلوق ہے جسے اب زمین میں بسایا جارہا ہے؟ یہ تیرے قانون سے سرکشی برتے گا جس کا نتیجہ فساد، لڑائی جھگڑے، ناہمواریاں اور خونریزیاں ہوگا۔ ہم اس نئی مخلوق میں خون کے چھینٹے دیکھ رہے ہیں۔ اس کے برخلاف ہم ہیں کہ جو فرائض ہمارے سپرد کئے گئے ہیں ہم ان کی سرانجام دہی میں ہمیشہ سرگرم عمل رہتے ہیں۔ اس پر خالقِ کائنات نے کہا کہ ہمارے اس جدید پروگرام کو تم نہیں سمجھ سکتے۔ ہم یہ سب کچھ جانتے ہیں۔

انسان میں اس امر کی امکانی استعداد رکھ دی گئی تھی کہ یہ ان قوانین کا علم حاصل کرسکے جس کے مطابق مختلف اشیائے کائنات سرگرم عمل ہیں۔ فرشتوں سے کہا گیا کہ اگر تم اپنے اس خیال میں سچے ہو کہ یہ جدید مخلوق تمہارے مقابلہ میں فروتر ہے تو بتاؤ! کیا تمہیں بھی یہ استعداد حاصل ہے؟

اس پر انہوں نے عجز سے اپنی گردن جھکا دی اور کہا کہ تیرے پروگرام ہماری حدِ نگاہ سے آگے ہوتے ہیں۔ ہم تو صرف اُتنا ہی جانتے ہیں جتنا ہمیں علم دیا گیا ہے۔ اس سے زیادہ اکتساباً کچھ معلوم کرلینے کی ہم میں استعداد ہی نہیں۔ تجھے کائنات کا کلی علم ہے اور تو ہی اپنے پروگرام کی غرض وغایت سے باخبر ہے۔

☆ اس پر کائناتی قوتیں سب انسان کے سامنے جھک گئیں، لیکن ایک چیز ایسی بھی تھی جس نے اس کے سامنے جھکنے سے انکار کردیا۔ اس نے سرکشی اختیار کی۔ یہ تھے انسان کے خود اپنے جذبات جن کے غالب آجانے سے اس کی عقل وفکر ماؤف ہو

جاتی ہے اور اتنی بڑی قوتوں کا مالک، خود اپنے ہاتھوں بے بس ہو جاتا ہے اور اس پر چاروں طرف سے مایوسیاں چھا جاتی ہیں۔

اُمتِ واحدہ کے تصور سے نا آشنا، انسانی زندگی کا پہلا دور:

ان صلاحیتوں کے ساتھ انسان کو دنیا میں بسایا گیا۔ اس کی ابتدائی زندگی کا نقشہ یہ تھا کہ اس کی ضروریات بہت محدود تھیں اور سامانِ نشوونما کی بڑی فراوانی تھی۔ اس نظامِ معیشت کی خصوصیات یہ تھیں کہ:

1۔ اس میں ''میری'' اور ''تیری'' کا امتیاز نہیں تھا۔

2۔ ''رزق'' کھانے پینے کے لیے تھا، ذخیرہ کرنے کے لیے نہیں۔

3۔ ''رزق'' ہر جگہ میسر تھا اور پیٹ بھر کر کھانے کے لیے میسر تھا۔

انسانی زندگی کا پہلا دور وہ تھا جب وہ بعد میں ہونے والی تمدنی زندگی سے نا آشنا تھا۔ قدرتی پیداوار پر اس کا گزارہ تھا اور وہ ہر ایک کو بافراط مل جاتی تھی کیونکہ ابھی تک ''میری اور تیری'' کا تصور پیدا نہیں ہوا تھا۔ سب ایک برادری کی شکل میں رہتے تھے۔ یہ تھی ''آدم'' کی وہ جنتی زندگی''۔ اس کے بعد ''میری اور تیری'' کا سوال پیدا ہو گیا تو ان کے باہمی مفاد میں ٹکراؤ شروع ہو گیا۔ اس طرح ان میں اختلافات پیدا ہو گئے۔ ان اختلافات کا مٹانا تنہا عقلِ انسانی کے بس کی بات نہیں تھی کیونکہ ہر فرد، ہر گروہ، ہر قوم کی عقل اس کے اپنے مفاد کا تحفظ چاہتی ہے۔ دوسروں کا مفاد اس کے پیشِ نظر نہیں ہوتا۔

حیاتِ جاوید اولاد کے ذریعے:

ابلیس نے آدم کے کان میں یہ سحر پھونکا تھا کہ تم حیاتِ جاوید اپنی اولاد کے ذریعے حاصل کر سکتے ہو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اپنی اپنی اولاد کے ذریعے جداگانہ تشخص نے آگے چل کر مختلف قبائل کی شکل اختیار کر لی۔ یہ وحدتِ انسانی میں پہلی تفریق تھی۔ اسی سے آگے چل کر نسلوں کی بنیاد پر انسانوں کی تقسیم عمل میں آ گئی۔

نسلوں کی بنیاد پر انسانوں کی تقسیم:

بعض علمائے انساب، نوعِ انسانی کی تقسیم اختلافِ رنگ کی بناء پر کرتے ہیں۔ مثلاً سفید فام، سیاہ فام یا سرخ فام۔ اور زرد فام۔ ان کے برعکس، تورات کا بیان ہے کہ طوفانِ نوح کے بعد جب انسانوں کی نئی زندگی شروع ہوئی تو نسلِ انسانی، حضرت نوحؑ کے تین بیٹوں یافث۔ حام اور سام سے آگے چلی اور موجودہ اقوامِ عالم انہی کی یادگار ہیں۔ حقیقت کچھ بھی ہو، یہ واقعہ ہے کہ نوعِ انسانی کی پہلی تفریق، قبیلوں کی شکل میں رونما ہوئی جن کی بنیاد نسل پر تھی۔

وطن کی بنیاد پر انسانوں کی تقسیم:

جب آبادی بڑھی تو مختلف قبیلوں نے نقلِ مکانی کر کے کسی دوسری سرزمین کو اپنا مستقر یا وطن قرار دے لیا۔ اس طرح جغرافیائی حدود یا وطنی امتیازات وحدتِ انسانی میں تفریق کا باعث قرار پائے۔ (اسی (وطنی) تفریق سے زبانوں کا اختلاف بھی رونما ہوا۔

پیشے کی بنیاد پر انسانوں کی تقسیم:

ایک قبیلہ (یا آگے بڑھ کر ایک قوم) میں تقسیم کار کے تقاضوں کی رو سے مختلف گروہوں نے مختلف کام اپنے ذمے لیے۔ اس سے پیشے، وجہِ اختلاف بن گئے۔ یعنی جو تفریق معاشرہ میں تقسیم عمل کی ضرورت کے ماتحت وجود میں آئی تھی۔ اس نے آگے چل کر ذاتوں اور برادریوں کی شکل اختیار کر لی۔ حتیٰ کہ ہندو دھرم نے انسانوں کو پیدائشی طور پر چار ورنوں (ذاتوں) میں تقسیم کر دیا۔ اور اس تفریق کو، برہما (خدا) کی متعین کردہ کہہ کر انمٹ قرار دے دیا۔

کم یا زیادہ کمانے کی صلاحیت سے طبقاتی تقسیم:

☆ پیشوں کی تفریق، یا مختلف افراد میں کمانے کی صلاحیت کے اختلاف سے کمائی میں فرق پیدا ہوا تو اس سے معاشی اعتبار سے مختلف طبقات وجود میں آ گئے۔ اور جب زیادہ طاقتور یا دولتمند طبقہ نے ذرائع پیداوار کو اپنی ذاتی ملکیت میں لے لیا تو اس طبقاتی تفریق کی گرہیں اور بھی مضبوط ہو گئیں۔

انسان پر اس کی انفرادی مفاد پرستیوں کے جذبات غالب آ گئے اور اس نے اپنے خود ساختہ نظام کے مطابق زندگی بسر کرنی شروع کر دی۔ انسانی برادری نسلوں، قبیلوں اور قوموں میں تقسیم ہو گئی۔ جس نے زیادہ قوت فراہم کر لی وہ رزق کے سرچشموں پر قابض ہو گیا۔ اس سے اس کی وہ جنتی زندگی چھن گئی۔ انسان مختلف گروہوں میں بٹ گیا، اور ایک گروہ دوسرے گروہ کا دشمن ہو گیا۔

اس کا حل تنہا عقل کے بس کی بات نہیں تھی۔ عقلِ انسانی ہر فرد کو اس کے مفاد کے تحفظ کی راہیں تو بتا سکتی ہے، عالمگیر انسانیت کے لیے امن وسلامتی کا طریق نہیں بتا سکتی۔ چنانچہ جب وہ جنت کی زندگی اس سے چھن گئی تو اس سے کہہ دیا گیا کہ تمہارے لیے مایوس ہونے کی کوئی بات نہیں۔ خواہ تم سب کے سب غلط راستے پر چل نکلو پھر بھی مایوسی کی کوئی بات نہیں۔ ہماری طرف سے، ہمارے رسولوں کی معرفت تمہاری طرف راہنمائی آتی رہے گی۔ جو لوگ اس راہنمائی کے مطابق زندگی بسر کریں گے وہ ہر قسم کے خوف و ہراس سے محفوظ رہیں گے۔

رسولوں کی وحی کے ساتھ ہوتا یہ رہا ہے کہ اللہ کا ایک فرستادہ نبی آتا، لوگوں تک اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچاتا، اس کے بعد شیطان صفت لوگ اس کی وحی میں اپنی طرف سے آمیزش کر کے اُسے کچھ سے کچھ بنا دیتے۔ اس کے بعد خدا ایک اور رسول بھیج دیتا اور سابقہ وحی کو اس آمیزش سے پاک اور صاف کر کے اپنے قوانین کو پھر سے محکم کر دیتا۔ اس لیے کہ خدا کو ہر بات کا علم ہوتا ہے اور اس کے سب کام حکمت پر مبنی ہوتے ہیں۔ یہ سلسلہ یونہی جاری رہا تا آنکہ اللہ تعالیٰ نے دینِ خالص، حضور نبی اکرم ﷺ کی وساطت سے، قرآن کریم میں محفوظ کر دیا اور اس کی حفاظت کا ذمہ خود لے لیا کہ اس میں کوئی تحریف یا آمیزش نہ کر سکے اور اس کے بعد وحی کے سلسلہ کو ختم کر دیا۔ اسے ختمِ نبوت کہا جاتا ہے۔

جو انسان اس نبی کے پیغام کی صداقت پر ایمان لے آتے، ان کے سابقہ اختلافات مٹ جاتے۔ وہ امتِ واحدہ بن

جاتی۔ وہ رسول چلا جاتا تو اس کے نام لیوا۔ اس کی کتاب میں تحریف کر کے امت میں تفرقہ پیدا کر دیتے۔ اس سلسلہ کے آخر میں ایک ایسی کتاب نازل کر دی جس میں کوئی ردوبدل نہیں کر سکتا۔ اس کتاب کی رو سے آخری نبی ﷺ نے ایک امتِ واحدہ متشکل فرمائی۔ وہ اس امت کو اس کتاب کا وارث بنا کر دنیا سے تشریف لے گئے۔ اس کے بعد مذہبی پیشواؤں نے پھر سر ابھارا۔ وہ اس کتاب میں تو ردوبدل کر نہیں سکتے تھے۔ انہوں نے ایک نیا عقیدہ وضع کر دیا کہ خدا کی وحی تمام تر اس کتاب (قرآنِ مجید) کے اندر نہیں۔ وحی کا بہت بڑا حصہ اس کے باہر بھی ہے۔ انہوں نے کتاب اللہ کو پسِ پشت ڈالا اور اس خارج از کتاب حصہ کو وحی کا درجہ دے کر، امت میں فرقے پیدا کر دیئے۔ ان فرقوں کو مٹانے کے لیے اب کوئی مامور من اللہ تو آئے گا نہیں کیونکہ مامورین من اللہ (انبیاء کرامؑ) کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے۔ اور کسی مامور من اللہ کے آنے کی اب ضرورت بھی نہیں کہ مامور من اللہ خدا کی کتاب لے کر ہی آیا کرتے تھے۔

اللہ کی کتاب اپنی اصل شکل میں ہمارے پاس موجود ہے۔ جب بھی ہم نے اپنے اختلافی معاملات کے صحیح اور غلط ہونے کے لیے اس کتاب کو حَکم مان لیا، ہمارے اختلافات مٹ جائیں گے۔ اور ہم پھر سے امتِ واحدہ بن جائیں گے۔ اور جب ہم خود امتِ واحدہ بن جائیں گے تو باقی دنیا کو امتِ واحدہ بنانے کا پروگرام مرتب کر کے اس مقصد کے حصول کے لیے مصروفِ تگ و دو ہو جائیں گے۔

عقلِ خود بیں غافل از بہبودِ غیر

☆ حضرات انبیاء کرامؑ، انسانوں کے اس تفرقہ کو مٹا کر ان میں وحدت پیدا کرنے کے لیے آتے تھے..... اور تاریخِ عالم اور قرآنِ کریم اس پر شاہد ہیں، کہ ان کے اس انسانیت ساز مشن کی سخت مخالفت ہوتی تھی۔ یہ مخالفت اس لیے ہوئی تھی کہ مفاد پرست اور استحصال پسند گروہوں کا مفاد اسی میں تھا کہ انسانوں میں یہ تفریق باقی رہے۔ یہ ہے دینِ خداوندی اور دنیاوی مفاد پرست گروہوں میں کشمکش کی اصل و بنیاد، جسے اقبالؒ نے ان دو جامع ابیات میں محصور کر دیا ہے۔

عقلِ خود بیں غافل از بہبودِ غیر سودِ خود بیند نہ بیند سودِ غیر

وحیٔ حق بینندۂ سودِ ہمہ درنگاہش سود و بہبودِ ہمہ

دوسری قوموں کے اہلِ فکر نے اپنے طور پر انسانیت کی بہتری کیلئے سوچا اور مختلف نتائج پر پہنچے۔ سلب و نہب، استحصال (Exploitation) سے نجات کی بہت سی راہیں تلاش کیں لیکن یہ تنہا عقلِ انسانی کے بس کی بات نہیں۔ ایک انسان کی عقل اِسے اپنا مفاد تو سمجھا سکتی ہے لیکن دوسروں کے مفاد سے اِسے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ اقبال کے لفظوں میں اسے عقلِ خود بیں کہتے ہیں۔ انسانوں کے مسائل کا حل اس عقلِ خود بیں کے بس کی بات نہیں اس کیلئے بلند تر سرچشمہ ہدایت جو سب انسانوں کے مفاد کو پیشِ نظر رکھے (عقلِ ہمہ بیں) کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو وحی خداوندی ہی سے ممکن ہے۔

قرآنِ کریم اس دینِ خداوندی (عقل جہاں میں) کو اپنی مکمل شکل میں آخری بار لے کر آیا اور حضور نبی اکرم ﷺ نے اس

کی روشنی میں ایک ایسی امت کی تشکیل فرمادی جونسل، رنگ، زبان وطن، قومیت، مذہب کے تمام اختلافات وتفریقات کومٹا کر وحدتِ انسانیت کا ماڈل بنی۔ اس طرح حضور ﷺ نے اقوامِ عالم کو سمجھا اور دکھا دیا کہ یہ ہے دنیا سے اس فساد کو مٹانے کا طریق جس نے انسان کی، اس جنتِ ارضی کو جہنم بنا رکھا ہے۔

حضور ﷺ نے اس دعوت کو پیش کیا اور جیسا کہ ہوتا چلا آ رہا تھا، مفاد پرست گروہ ہجوم کر کے اس دعوت کی مخالفت کے لیے اُمنڈ آئے۔ انہیں خطرہ تھا کہ اگر یہ نظام کسی ایک خطۂ ارض میں بھی قائم ہوگیا۔ تو ان کے سلب ونہب کے دمدموں (Tanks) سے پسی اور کچلی ہوئی انسانیت جوق در جوق اس کی طرف آ جائے گی اور انہیں دنیا میں کہیں پناہ نہیں مل سکے گی۔

تمام انسانوں کے امتِ واحدہ ہونے کی دلیل:

قرآنِ پاک کی مندرجہ ذیل آیات نوعِ انسانی کے امت واحدہ ہونے کی دلیل کے طور پیش کی جاسکتی ہیں:

1۔ تمام انسان امتِ واحدہ سے انہوں نے باہمی اختلافات پیدا کر لئے۔ (10:19) ان اختلافات کو مٹانے کے لیے انبیاء مبعوث ہوئے۔ اور ان کے ساتھ ضابطۂ حیات بھیجا گیا تا کہ وہ اس کی روشنی میں لوگوں کے اختلافی معاملات کا فیصلہ کریں۔ (57:25، 22:13)

2۔ تمام انسانوں کی تخلیق نفسِ واحدہ ہے۔ (4:1) سب کے لیے ایک ہی طریقِ تخلیق (فطرت) (30:30) تمہاری تخلیق اور نفس واحد کی طرح ہے۔ (31:28)

3۔ جس نے ایک جان کو بھی ناحق تلف کر دیا اس نے گویا تمام نوعِ انسانی کو ہلاک کر دیا۔ جس نے ایک جان بھی بچالی اس نے گویا تمام نوعِ انسانی کو حیات عطا کر دی۔ (5:32)

4۔ حیوانات یا دیگر اشیائے کائنات میں اختلافات نہیں ہوتے۔ لیکن ان کی یہ وحدت بالارادہ نہیں۔ مجبوری کی ہے۔ انسانوں میں اس طرح وحدت پیدا کرنا مقصود نہیں۔ یہ سوچ سمجھ کر، اپنے اختیار وارادہ سے ایک برادری کے افراد بنیں۔ (119-11:118)

5۔ قا اس نظریۂ حیات اور اس نظام کے لیے ہے جو تمام نوعِ انسان کے لیے منفعت بخش ہو۔ (13:17)

6۔ اگر تمام انسانوں کو امتِ واحدہ میں متشکل کرنا مقصود نہ ہوتا تو دولت کو انبار در انبار چند افراد (کفار) کے پاس مرکوز ہونے دیا جاتا۔ (43:33)

7۔ شعوب وقبائل محض باہمی تعارف کے لیے ہیں۔ تخلیقِ انسانی میں یہ تفریق نہیں۔ وجہ تکریم ذاتی کیریکٹر ہے۔ (49:13)

8۔ امتِ واحدہ کی تشکیل اس دور میں ہوگی جب تمام انسان، خدا کی ربوبیت عالمینی کے لیے اُٹھ کھڑے ہوں گے۔ (83:8) اور اس طرح لوگ جوق در جوق دینِ خداوندی میں داخل ہو جائیں گے۔ (110:2)

9۔ جنہیں ملانے کا خدا نے حکم دیا ہے انہیں ٹکڑے ٹکڑے مت کرو۔(13:21۔25،2:27)

10۔ اختلافِ رنگ اور زبان، اہلِ علم کے لیے اس حقیقت تک پہنچنے کی نشانیاں ہیں۔ اور بس۔(30:22) ورنہ تخلیق سب کی ایک ہی مادہ سے ہوئی ہے۔(30:19) یہ محض طبعی زندگی (یعنی جسم) کے اختلافات ہیں جو حیوانات میں بھی ہیں۔ (35:38) انسانی سطح پر زندگی کا معیار اس سے بلند ہو جاتا ہے۔ اس کی رو سے مدارج کا تعین جوہرِ ذاتی کی رو سے ہوتا ہے۔(46:19)

11۔ پیسے وجہِ اختلاف و باعثِ تفریق نہیں ہو سکتے۔(26:111۔112،11:27۔29)

12۔ تمام انسان (ابنِ آدم) یکساں واجب التکریم ہیں۔(17:70)

پیدائش کے اعتبار سے سب انسان برابر:

☆ تمام نوعِ انسانی کے امتِ واحدہ ہونے کی دلیل میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ تمام نوعِ انسانی اپنی پیدائش کے اعتبار سے زندگی کے ایک ہی Cell سے پیدا ہوئی ہے۔ تمام انسان ایک جیسے برابر ہیں۔ امریکہ کے گورے کو افریقہ کے کالے پر کوئی افضلیت حاصل نہیں۔ دونوں ایک جیسی بنیادی ضروریات اور حقوق رکھتے ہیں۔ اس اعتبار سے تمام انسان بھائی بھائی ہیں۔

خیر و شر کے عمل:

☆ قرآن پاک کے نزدیک صرف وہ عمل خیر ہے جو نوعِ انسانی کی بھلائی کیلئے ہو۔ اگر کوئی عمل نوعِ انسانی کیلئے نقصان کا باعث ہوتا ہے تو قرآنی معیار کے مطابق وہ شر ہے۔ قرآنِ پاک نے اپنے قوانین کو تمام عالم انسانیت کیلئے مشترکہ قوانین کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ قرآن حکیم کا دعویٰ ہے کہ اس کی ہدایات کی روشنی میں انسان کو وہ راہنمائی مل سکتی ہے جو اس کو صحیح و سالم منزلِ مقصود تک پہنچا سکتی ہے۔

سب انسان اللہ کی مخلوق:

☆ اللہ تعالیٰ نے ہی انسان کو تخلیق کیا۔ تمام انسان اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں اور اللہ سے قربت کے لحاظ سے Equi-distant ہیں۔ یعنی جس طرح ایک دائرے میں کھڑے تمام انسان مرکز میں کھڑے سردار سے برابر کے فاصلے پر ہوں گے اسی طرح دنیا کے تمام انسان رنگ نسل مذہب کے فرق کے باوجود اللہ تعالیٰ کے حضور برابر کے قریب ہیں۔

زمین پر کھینچی کسی ملک کی سرحدوں کی لائن، کسی انسان کو دوسرے انسان پر نہ برتری دلاتی ہے، نہ ہی اس کے کسی حق میں کمی کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ رب العالمین ہے۔ محمد رسول اللہ ﷺ رحمت للعالمین ہیں اور قرآنِ پاک ذکر العالمین ہے۔

(جاری ہے)

ڈاکٹر انعام الحق، اسلام آباد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(قسط نمبر 8)

دو قومی قرآنی نظریہ پر مطالبۂ پاکستان

1۔ ڈارون کے نظریہ میں حقیقتِ ارتقاء:

جہاں تک اس پہلے حصہ حقیقتِ ارتقاء کا تعلق ہے وہ دنیا کے علمی مسلمات میں شمار ہوتا ہے اور آج حکماء میں سے شاید ہی کوئی شخص ایسا ہوگا جو اس سے اتفاق نہ رکھتا ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ڈارون کے زمانے سے لے کر اب تک اس کے خلاف ایک بات بھی معلوم نہیں ہوسکی بلکہ اس کے برعکس بے شمار دلیلیں اور شہادتیں اس کے حق میں پیدا ہوئی ہیں۔ آج بھی ہماری آنکھوں کے سامنے ہر چیز میں ارتقاء ہو رہا ہے۔ کوئی چیز یکا یک وجود میں نہیں آتی اور ہر چیز بتدریج پیدا ہوتی ہے۔ ڈارون کے اس نظریہ کے حصہ نے کوئی نئی بات پیش نہیں کی بلکہ لوگوں کے مشاہدہ کے نتائج کو عقلی سہارا دیا ہے، اور ان کو ذرا وسعت دے دی ہے، اور لوگوں کی توجہ کو زیادہ شدت کے ساتھ حقیقتِ ارتقاء کے عقیدہ کی طرف مبذول کر دیا ہے۔

ڈارون کے اس نظریہ کا البتہ ایک اثر یہ ہوا کہ اب حکماء عام طور پر سمجھنے لگے ہیں کہ ارتقاء فقط انواع حیوانات کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ حیوانات کے وجود میں آنے سے پہلے کی مادی کائنات بھی جو اس قابل تھی کہ اس میں زندگی نمودار ہو سکے ایک ارتقائی عمل سے اپنی ترقی یافتہ حالت کو پہنچی تھی۔ اس طرح سے کائنات کے ارتقاء کے تین تین مرحلے ہو جاتے ہیں۔

1۔ کائنات کی ابتدا کی حالت سے لے کر جمادات و نباتات کی حالت تک جب وہ اس قابل ہوں کہ اس میں زندگی کا ظہور ہو سکے۔

2۔ پھر جمادات و نباتات سے لے کر از خود حرکت کے حامل زندہ حیوان کے ظہور اور طبیعی نسلِ انسانی کے ظہور تک۔

3۔ اور پھر طبیعی انسان کے ظہور سے لے کر انسان کی نفسیاتی تکمیل تک ذات کا یہ مرحلہ جو اس وقت تک بھی جاری ہے۔

2۔ ڈارون کے نظریہ میں سببِ ارتقاء

جیسا کہ آگے نظریہء ارتقاء کی قرآن کی روشنی میں وضاحت ہوگی ہم دیکھتے ہیں کہ ڈارون کے نظریہ محض ارتقاء کا تصور جس قدر حقیقت اور قرآن کے مطابق ہے اور صحیح ہے، اسی قدر سببِ ارتقاء کا تصور حقیقت اور روح قرآن کے خلاف ہے۔ البتہ بعض لوگ پہلے حصہ کے حق میں ناقابلِ تردید دلائل کی وجہ سے فریب کھا کر دوسرے حصے کو بھی صحیح سمجھ لیتے ہیں۔ سببِ ارتقاء کے متعلق ڈارون کی تشریح کئی وجوہات سے ناقص ہے جس میں دو کا ذکر کرنا مقالہ کے عنوان کے تناظر کی حیثیت سے بھی

ضروری ہوجاتا ہے۔

1۔ڈارون ہمیں یہ بتانے سے قاصر ہے کہ محض اتفاقات یا قدرت کی تخریبی کاروائیوں سے کائنات کے نظام میں یہ حیرت انگیز موزونیت اور مطابقت کیوں کر پیدا ہوجاتی ہے۔؟

2۔ڈارون ہمیں یہ نہیں بتاتا کہ جسم حیوانی میں تغیرات کیوں کر محض اتفاقات سے نمودار ہوتے رہتے ہیں؟۔

اِس کی وضاحت میں ایک جرمن ماہر حیاتیات ڈریش (Driesh) نے معمل (تجربہ گاہ) کے اندر تجربات کر کے ثابت کیا ہے کہ جسم حیوانی کے اندر ایک ایسا مقصد یا مدّعا کارفرما ہوتا ہے جو اس کی شکل وصورت کو متعیّن کرتا ہے۔ڈریش کے تجربات اس نتیجہ پر پہنچنے پر مجبور کرتے ہیں کہ حیوان جسم کی ایک خاص شکل وصورت کو حاصل کرنے اور قائم رکھنے کے لیے ایک اندرونی میلان کا اظہار کرتا ہے۔یہ ایک مجموعہ اشیاء کی طرح نہیں بلکہ ایک ناقابلِ تقسیم کل یا وحدت کی طرح عمل کرتا ہے جس کے اندر ایک رجحان طبیعت ایسا ہے جو اس کل یا وحدت کی ضروریات کی خبر رکھتا ہے۔

اسی طرح برگسان ارتقاء کے اُن تمام نظریات کو غلط قرار دیتا ہے جو زندگی کی تخلیقی اور مُدعائی فعلیت (Purpose activity) کی بجائے کشمکش حیات کی ضرورت اور بقائے اصلح کے تصور پر مبنی ہیں۔

نظریہ ارتقاء کے اسباب کے مقاصد:

ڈاکٹر محمد رفیع الدین نے البتہ نظریہِ ارتقاء کے مقاصد کی وضاحت کی ہے کہ:

1۔یہ مقصد اپنے آپ کو ٹھیک طرح جانتا ہے اور اپنی اغراض کے لیے شکل وصورت کو بدلنے پہ پوری قدرت رکھتا ہے۔

2۔چونکہ سب سے پہلا جاندار جو کیچڑ میں پیدا ہوا تھا۔شروع ہی سے ارتقاء کے عمل میں تھا اور ارتقاء کی آئندہ غرضوں اور اُمیدوں کے عین مطابق تھا۔اس لیے یہی مقصد تھا جس نے اس جاندار کو پیدا کیا تھا۔

3۔چونکہ اس جاندار کے وجود میں آنے سے پہلے مادی کائنات اپنے تمام ارتقائی مدارج طے کر کے ایک ایسی شکل میں موجود تھی جس کے بغیر یہ جاندار وجود میں نہیں آسکتا تھا۔لہٰذا مادی کائنات کا ارتقاء اس جاندار کی تخلیق ہی کی ایک تیاری تھی اور اس ارتقاء کا باعث بھی یہی مقصد تھا۔

4۔پھر چونکہ مادہ کی اوّلین صورت بھی شروع ہی سے ارتقاء کے عمل میں تھی اور بعد کے مادی ارتقاء کے لیے موزوں بھی تھی اس لیے یہی وہ مقصد تھا جس نے مادہ کو نیست سے ہست کیا تھا۔

5۔لہٰذا یہ مقصد کوئی مادی چیز نہیں اور محض ایک مقصد ہی نہیں بلکہ ایک خود شناس شعور یا نفس (Mind) ہے بلکہ ایک خلاق وقدیر شخصیت (Personality) ہے جو کائنات کی اصل حقیقت ہے۔

اِنہی مقاصد کی تائید میں نظریہ ارتقاء کے ماہرین کی برسوں کی تحقیق سے یہی دریافت کیا گیا ہے کہ دنیا میں بقاءِ اصلح کے قانون کے نتیجہ میں تین اقسام کی انواع پائی جاتی ہیں:

ایک تو وہ جن کے پنجر تو دریافت ہوئے ہیں، لیکن وہ حوادثاتِ زمانہ کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت حاصل نہ کرنے کی وجہ سے صفحۂ ہستی سے ہی نابود ہو گئیں۔

دوسرے وہ اپنی ہستی تو برقرار رکھ سکیں لیکن مسابقت کی صلاحیت سے محروم ہونے کی بنا پر مزید ارتقاء نہ حاصل کر سکیں۔

تیسرے وہ جو زمانہ کے حوادثات کا دلیری سے مسابقت کی تقویت کے حصول کے بعد مزید ارتقاء کر رہی ہیں۔

قرآن نے تیسری قسم نوع کی ارتقاء کے بقاءِ للاصلح کے مقصد کے حصول کے لئے حسنات کے پلڑے کے جُھکنے کی صورت میں یہی اصول بتا کر ماہرینِ ارتقاء کے موقف کی تائید کی ہے کہ

اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ ؕ (11:114)

''یقیناً حسنات یعنی ہمواریاں انسانی معاشرے اور انسانی ذات سے ناہمواریوں کو مٹا دیتی ہیں۔''

مٹا دینے سے مراد یہ ہے کہ ترازو کے پلڑے میں ناہمواریاں زیادہ ہوں تو ناہمواریوں والا پلڑا جھک جاتا ہے، اور اگر معاشرے اور انسانی ذات میں ہمواریاں پیدا کرنے والے کام کیے جائیں، تو پھر ہمواریوں والا پلڑا جھک جاتا ہے۔ اِس لئے بھی کہ ناہمواریاں منہا Minus ہو جاتی ہیں الْحَسَنٰتِ پر مبنی وہی کام شمار کیے جائیں گے، جن سے ایک طرف تو معاشرے میں ہمواریاں پیدا ہوتی چلی جائیں یعنی وہ معاشرے کے لئے مفید ہوں، اور دوسری طرف ایسا کرنے والے کی ذات میں نشوونما ہوتی چلی جائے۔ السَّیِّاٰتِ پر مبنی وہی کام شمار ہوں گے، جن سے معاشرے میں ناہمواریاں پیدا ہوتی چلی جائیں، یعنی وہ کام معاشرے کے لئے غیر مفید ہوں، اور ساتھ ہی ایسا کرنے والے کی ذات مضمحل ہو جائے۔ لہٰذا اس اصول کو سامنے رکھو کہ اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ ؕ یقیناً حسنات یعنی ہمواریاں انسانی معاشرے اور انسانی ذات سے ناہمواریوں کو مٹا دیتی ہیں''۔

ارتقاء کے جدید نظریات میں ہیگل اور برگسان کے درجِ ذیل نظریات کو بہت اہمیت حاصل ہے۔

ڈارون کی تحقیقات کا رخ میکانکی اصولوں کی طرف جا رہا تھا۔ لیکن دورِ حاضر کی تحقیقات میں پروفیسر مارگن (Lloyed Morgan) کے نظریہ فجائی ارتقاء (Emergent evolution) کے انکشاف نے ارتقائی سائنس میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔

مارگن کا نظریہ فجائی ارتقاء:

بتدریج ارتقاء کے مراحل علت و معلول کی کڑیاں عبور کرتے ہوئے سلسلہ وار آگے بڑھتے ہیں۔ فجائی نظریہ کی رو سے بعض اوقات ایک نوع علت و معلول کی کئی کڑیاں پھاند کر دوسری نوع میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ یہ کس طرح ہوتا ہے۔

اس کے متعلق پروفیسر مارگن لکھتا ہے:

اگر یہ پوچھا جائے کہ تم جس چیز کو فجائی کہتے ہو وہ بالآخر ہے کیا؟ تو اس کا مختصر جواب فقط اس قدر ہے کہ

یہ ایک نئی قسم کا رابطہ ہوتا ہے اور اگر یہ پوچھا جائے کہ یہ روابط کس اعتبار سے نئے ہوتے ہیں تو اس کا جواب اتنا ہے کہ ان نئے قسم کے رابطوں کی خصوصیات کے متعلق ان کے ظہور پذیر ہونے سے پہلے کبھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

اس حقیقت کے متعلق برگسان (Bargson) لکھتا ہے:

جس بنیادی غلطی نے ارسطو سے لے کر آج تک فلسفہ فطرت کو مکدر کر رکھا ہے وہ یہ ہے کہ اس فلسفہ کی رو سے نباتی احساس، حیوانی جبلت اور انسانی شعور کو ایک ہی میلان (Tendency) کے تین درجے تسلیم کیا جاتا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک عمل کی تین مختلف شاخیں ہیں جو ایک دوسرے سے یکسر الگ الگ ہیں۔ ان میں باہمی فرق نہ تو درجات (Degree) کا ہے اور نہ ہی شدت (Intensity) کا۔ ان میں نوعی فرق (Difference of kind) ہے۔

اس بحث سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ حیوانی شعور صرف حسّیاتی علم کی صلاحیت رکھتا ہے۔ جب کہ انسانی شعور، تصوراتی علم کی بھی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہ چیز حیوانی شعور کے ارتقاء سے حاصل نہیں ہو سکتی بلکہ یہ کوئی اور ہی چیز ہے۔

میکانکی تصور حیات نے کہا تھا کہ کائنات میں مادہ میں تبدیلیاں ہو رہی ہیں جدید تخلیق نہیں ہوتی عصر حاضر کی تحقیق سے البتہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ سلسلہ ارتقاء کے ساتھ جدید تخلیق کا سلسلہ بھی جاری ہے۔

سلسلہ ارتقاء کے باب میں اب یہ حقیقت بھی سامنے آ رہی ہے کہ ارتقاء کے معنی یہ نہیں کہ اب تخلیق جدید نہیں ہو رہی۔ فجائی ارتقاء درحقیقت تخلیقِ جدید ہی ہے۔ اس انکشاف نے نظریہ میں اہم تبدیلی دی ہے۔

جدید فجائی تخلیق پر پروفیسر الیگزینڈر کا تبصرہ:

پروفیسر الیگزنڈر فجائی ارتقاء یا ارتقائے بروزی کی ترجمانی میں کہتا ہے کہ جامد مادہ، حرکی مادہ اور ذہنِ انسانی بتدریج ارتقاء پذیر نہیں ہوتے ہیں۔ اس نشوونما کا تصور وہی ہے جو لائڈ مارگن نے پیش کیا ہے اور اسے بروز (فجائی) کا نام دیا ہے۔ حیات کا بروز یعنی نمو مادے سے ہوا ہے۔ ایک زندہ شے مادی شے ہے البتہ اس میں ایک نئی صفت کا ظہور ہوتا ہے جسے حیات کہتے ہیں۔ یہی بات ہم اُس عمل سے متعلق کہہ سکتے ہیں جو حیات سے ذہن کی جانب ہوتا ہے۔ ایک ''باذہن شخص'' زندہ بھی ہوتا ہے لیکن اس کے ارتقاء میں ایسی پیچیدگی ہوتی ہے اور اس کے اجزاء ترکیبی اس قدر مربوط ہوتے ہیں، بالخصوص اس کے نظام عصبی میں یہ ربط و نظم اس قدر نازک اور دقیق ہوتا ہے کہ اس سے ذہن یا شعور کی نمود ہوتی ہے۔

وہ کہتا ہے:

یہ کیوں سمجھ لیا جائے کہ یہ ارتقائی عمل ذہن پر آ کر رک جائے گا۔ ذہن سے آگے بھی ایک صفت کا نقش ملتا ہے، جس کا ذہن سے وہی تعلق ہے جو ذہن کا حیات سے اور حیات کا مادے سے ہے۔ الیگزنڈر اس کی وضاحت کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اس صفت کو میں یزدانیت کہتا ہوں اور جس شے میں یہ پائی جاتی ہے وہ خدا ہے۔

یہاں خدا سے الیگزانڈر عملِ ارتقاء کے دوران ظہور بارزہ کا اگلا مرحلہ مراد لیتے ہوئے وہ مزید وضاحت کرتا ہے کہ:

کائنات کی جو سطح بھی ہو خدا اس سے بلند ہوتا ہے۔ مثلاً جب کائنات جمادات کی سطح پر تھی تو خدا نباتاتی سطح پر تھا۔ جب کائنات نباتاتی سطح پر آ گئی تو خدا حیوان کی سطح پر تھا۔ جب کائنات حیوان کی سطح پر آ گئی تو خدا انسان (یعنی شعور) کی سطح پر تھا۔ اب کائنات شعور کی سطح پر ہے تو خدا ملائکہ کی سطح پر ہے۔ اس طرح کائنات کی سطح اونچی ہوتی چلی جاتی ہے۔ یہ بلند سطح اس کے نزدیک (Deity) کہلاتی ہے

جدید تخلیق کا برگسان کا نظریہ:

فرانسیسی فلسفی برگسان کہتا ہے کہ جسے حقیقت کہا جاتا ہے وہ کوئی جامد و ساکت (stationary) چیز نہیں ہوا کرتی بلکہ یہ تو گزرانِ مسلسل یا سیلانِ پیہم کا ایک ایسا عالم دوام (World of continuity) ہے جو ہر لحہ حالت تکوین (ہونے) یعنی State of becoming میں رہتا ہے۔ نئے سے نئے خواص اور نئی سے نئی کیفیات پیش آتی رہتی ہیں، جن کیفیات اور خواص کو جدید قوانین اور سائنس بھی انتہائی حساس ہونے کے باوجود جان لینے پر قادر نہیں۔ برگسان کا خیال ہے کہ حقیقت ایک ایسی حقیقتِ دوران (Real Duration) ہے جو مستقل طور پر ایک ارتقائی تغیّر کی حالتِ مدام کی زد میں رہتی ہے۔

برگسان مزید کہتا ہے کہ:

حقیقت کا سب سے اہم تشکیلی وصف اس کے اندر سرایت کردہ حیاتی قوت و تحریک ہے، جسے وہ اصطلاحاً جوشِ حیات کے نام سے موسوم کرتا ہے اور جسے زندگی اور شعور کی صورتوں میں مدرک کیا جا سکتا ہے۔ اس جوشِ حیات (Elan vital) کا ارتقائی عمل نہ صرف یہ کہ کائنات کو غیر طبیعی قانون (Non-Physical Laws) کے تحت ہر لحہ متغیّر بنائے رکھنا ہے بلکہ ایک پورا دشتِ امکان اس کے سامنے کھول دیتا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح سے ایک فنکار اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے زیر اثر نئی سے نئی روشن تر اور بہتر ایک دنیا اپنے کینوس پر ابھار کر منظر عام پر لاتا رہتا ہے اور پھر بھی کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ تخلیق کا اگلا لمحہ کب اور کس طرح ایک نئی صنفِ رنگ دنیا کو جنم دے گا۔

برگسان کی رو سے تخلیقی عمل آج بھی آگے کی جانب بڑھتے ہوئے بلند سطحوں کو چھو رہا ہے اور عین ممکن ہے کہ یہ انسان کی لافانیت کے مراحل میں بھی داخل ہو جائے کیونکہ جوشِ حیات کے لیے کچھ بھی کر گزرنا ناممکن نہیں ہے۔ یہ کسی بھی امکان کو اظہار و واقعیت کے پیکر میں ڈھالتے رہنے کا عمل ہے۔ یہ قوت جسے ''جوشِ حیات'' کہا جاتا ہے ایک بالکل ہی آزاد عمل ہے جو آپ ہی آپ چھلک پڑتا ہے۔ اور ایک انجانی دنیا کی طرف نکل جاتا ہے جو ابھی عالم وجود میں آئی ہی نہیں۔

ابن مسکُوَیہ کا نظریہ ارتقاء:

علامہ اقبالؒ نے خطبات میں ابن مسکویہ کی تصنیف الفوز الاصغر سے ارتقاء کا مفروضہ نقل کیا ہے۔

ابن مسکُوَیہ کہتا ہے نباتات کی زندگی پر نظر ڈالیے تو ارتقاء کے اوّلین مراحل میں نہ تو ان کی پیدائش اور نمو کے لیے بیج کی

ضرورت ہوتی ہے، نہ اپنی نوع کے تسلسل کے لیے انھیں اس سے کام لینا پڑتا ہے۔ لہٰذا اس مرحلے پر ہم نباتات کی زندگی اور معدنیات میں یونہی فرق کریں گے کہ یہ وہ مرحلہ ہے جس میں نباتات کو عمل فجائی سے تھوڑی بہت حرکت کی طاقت مل جاتی ہے۔ اور پھر اعلیٰ تر انواع کی صورت میں برابر بڑھتی رہتی ہے تا آنکہ اس کا اظہار اس طرح ہوتا ہے کہ پودے شاخیں نکالتے اور بیجوں کے ذریعے اپنی نوع کا تسلسل قائم رکھتے ہیں۔ لیکن پھر حرکت کی اس قوت میں رفتہ رفتہ اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ حتیٰ کہ درخت پیدا ہو جاتے ہیں۔ ان کے تنے ہوتے ہیں اور وہ برگ و بار لاتے ہیں۔ اب اس سے بھی آگے بڑھیے تو نباتات کے ارتقاء کا آئندہ مرحلہ وہ ہے جس میں ایسی انواع کا ظہور ہوگا جن کے لیے زیادہ بہتر زمین اور زیادہ بہتر آب و ہوا کی ضرورت ہوگی۔ انگور اور کھجور ارتقائے نباتی کی آخری منزل ہیں جس کے ڈانڈے گویا حیوانی زندگی سے جا ملتے ہیں۔ چنانچہ کھجور کے اندر تو جنسی اختلاف بھی صاف طور پر نمایاں ہو جاتا ہے کیونکہ کھجور میں جڑوں اور ریشوں کے علاوہ وہ شے بھی نشوونما پا لیتی ہے جس کا وظیفہ کچھ ویسا ہی ہوتا ہے۔ جیسے دماغ کا اور جس پر گویا اس کی سلامتی اور حفظ و بقا کا دارومدار ہے۔ یہ نباتات کی زندگی میں ارتقاء کا آخری درجہ ہے یا یوں کہیے کہ حیوانی زندگی کی تمہید ہے۔

حیوانی زندگی کا پہلا قدم زمین پیوستگی سے آزادی ہے جسے گویا شعوری حرکت کی ابتداء سے تعبیر کرنا چاہیے۔ اسے حیوانی زندگی کا آغاز کہیے۔ جس میں اوّل حس لامسہ اور بالآخر حس باصرہ کی نشوونما ہوتی ہے۔ مگر پھر جب حواس نشوونما حاصل کر لیتے ہیں تو حیوانات نقل و حرکت میں آزاد ہو جاتے ہیں۔ مثلاً حشرات الارض، رینگنے والے جانور، چیونٹیاں اور شہد کی مکھیاں، چوپایوں میں گھوڑا حیوانیت کا مظہر اتم ہے اور پرندوں میں عقاب۔ آخر الامر جب بندروں کا ظہور ہوتا ہے تو حیوانیت گویا انسانیت کے دروازے پر آ کھڑی ہوتی ہے۔ اس لیے کہ بندر باعتبار ارتقاء انسان سے صرف ایک ہی درجہ پیچھے ہیں۔ ارتقاء کے مزید مراحل میں کچھ اور عضویاتی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں جن کے پہلو بہ پہلو انسان کی قوتِ تمیز اور روحانیت میں بھی اضافہ ہوتا رہتا ہے، تا آنکہ وحشت کی زندگی ختم ہو جاتی ہے اور انسان تہذیب و تمدن کی دنیا میں قدم رکھ دیتا ہے۔

نظریہ ارتقاء کا ڈارون نے سائنسی طریق سے جائزہ لیا ہے جسے ابتدائی دریافت کی بنا پر ابھی تک اہمیت دی جاتی ہے مشہور فلسفی ارسطو نے نظریہ ارتقاء کا تجزیہ البتہ نظریاتی بنیاد پر پیش کیا ہے اور وہ بھی بہت اہمیت کا حامل رہا ہے، جس کی بحث کے بغیر موضوع تشنہ رہ جاتا ہے۔ اس کے نظریہ کی وضاحت مختصر الفاظ میں یوں کی جا سکتی ہے۔

ارسطو کا نظریہ ارتقاء:

نظریہ ارتقاء کے تحت حکمائے یونان میں ارسطو نے وضاحت سے بتایا ہے کہ:

دنیا میں سب سے پہلے ہمیں جس چیز سے واسطہ پڑتا ہے وہ غیر مخصوص مادہ ہے جو اگرچہ مطلقاً صورت سے تہی نہیں لیکن اس میں صورت کی حد درجہ کمی ہوتی ہے۔ مادہ کی سب سے نچلی شکل بے صورت مادہ سے مشابہت رکھتی ہے۔ صورت اس میں صحیح طور پر داخل نہیں ہوتی، یعنی اس کا نصب العین یا صورت اس سے باہر خارج میں موجود ہوتی ہے۔ چنانچہ ابتدائی سٹیج پر مادہ

کسی صورت کے حصول کے لیے حرکت کرتا ہے۔ یہ حرکت کسی خاص صورت کی طرف ہوتی ہے، اس لیے یہ حرکت خط مستقیم میں جاری رہتی ہے۔ ہلکے اجسام اوپر کی طرف اٹھتے ہیں اور بھاری اجسام نیچے کی طرف آتے ہیں۔ ان دو عملوں کو ارسطو کشش ثقل (Gravitation) اور صعود (Levitation) کا نام دیتا ہے۔

غیر عضوی (بے صورت) اور بے جان مادہ کے ارتقاء کے بعد عضوی مادہ کی دوسری سٹیج آتی ہے۔ یہاں زندگی کا ظہور ہوتا ہے۔ مادہ خود کو منظم کر لیتا ہے اور اس کی صورت خارج میں نہیں بلکہ خود عضویہ میں روح کی حیثیت سے جاری وساری ہوتی ہے۔ عضویہ کا حرکی اصول یا علّتِ فاعلی، غیر عضوی مادہ کی طرح خارج میں نہیں بلکہ خود اس کے اندر موجود ہوتی ہے۔

زندگی کا اوّلین ظہور نباتات میں ہوتا ہے جن میں زندگی کی دو ابتدائی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔

اوّلاً تجاذب غذا (Nutrition) اور ثانیاً تولید (Reproduction)۔

نباتات کے ارتقاء کے بعد حیوانی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ حیوانات میں علّت فاعلی کی پودوں اور درختوں سے بہتر صورت ہوتی ہے۔ مادہ حیوانی عضویہ میں خود کو مزید منظم کر کے سطح زمین سے علیحدہ ہو جاتا ہے۔ حیوانی روح عضویہ کے لیے صورت یعنی علت فاعلی کی حیثیت رکھتی ہے۔ چنانچہ حیوانوں میں خود حرکتی (Locomotion) پائی جاتی ہے۔

تجاذب غذا اور تولید کے ساتھ حیوانوں کی زندگی میں حس (Sense) بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے ہی حیوانات، نباتات سے بلند تر مقام پر فائز ہیں۔ اس حس کو البتہ ارسطو فہم عام (common sense) تک محدود رکھتا ہے۔ یہ دراصل وہ شعوری کیفیت ہے، جو حیوانوں اور انسانوں کے حواس میں یکساں طور پر پائی جاتی ہے اور جس کی وجہ سے تحسّات کی وحدت قائم ہوتی ہے۔ مثلاً میں میز کو دیکھتا ہوں تو مجھے ایک تحسس حاصل ہوتا ہے کہ یہ سرخ ہے۔ اس کے بعد اسے ہاتھ سے چھوتا ہوں تو ایک دوسرا سا تحسس حاصل ہوتا ہے کہ یہ ٹھوس ہے۔ دونوں تحسسات ایک ہی شے کے بارے میں ہیں۔ میز سرخ بھی ہے اور ٹھوس بھی۔ ارسطو کہتا ہے کہ تجربہ کی وحدت اسی فہم عامہ کی وجہ سے ہے۔ اس لیے حیوانات سے کم تر مخلوق یعنی پودوں اور درختوں کو فہمِ عام کے نہ ہونے سے لذت اور الم کا بھی احساس نہیں ہوتا۔

حیوانات سے ارتقاء کے بعد انسان کی سٹیج آتی ہے۔ مادہ یہاں خود کو بہت زیادہ منظم کر لیتا ہے۔ انسانی عضویہ کی صورت یعنی انسان کی روح، حیوانی روح سے افضل ہے۔ اس میں اگرچہ نباتی اور حیوانی زندگی کی تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں، مگر اس میں عقل بھی ودیعت کر دی گئی ہے۔ حیوانی زندگی میں تفکر نہیں پایا جاتا۔ دنیا میں صرف انسان ہی ایسی مخلوق ہے جو عقل رکھتی ہے۔

اس منفرد خصوصیت کی وجہ سے فہم عامہ سے بڑھ کر انسانی روح میں قوت متخیلہ (Imagination) ہے۔ اس سے مراد وہ قوت ہے جس سے ذہن اشیاء کی تصویریں بناتا ہے۔ جب کوئی شے سامنے موجود ہو تو ہم حواس کے ذریعے اس کا تجربہ کرتے ہیں۔ اور جب وہ شے سامنے سے ہٹ بھی جائے تو اس کا عکس ذہن میں موجود رہتا ہے۔ ایسے عکس یا ذہنی صورتیں بنانے کی قوت کا نام قوت متخیلہ ہے۔

قوت متخیلہ سے بلند تر حصہ یاد (Memory) کی قوت بھی ہے۔ یاد اور قوت متخیلہ میں بنیادی فرق نہیں۔ البتہ یاد میں ذہنی تصویر کے علاوہ آگہی بھی ہوتی ہے کہ یہ کسی خاص شے کا عکس ہے۔ اس یاد کو روح انسانی میں بازیافت (Recollection) کی صفت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یادیں غیر ارادی طور پر ذہنی سکرین پر سے گزرتی رہتی ہیں۔ لیکن یاد یعنی بازیافت وہ عمل ہے جس کے ذریعے ہم ارادی طور پر کسی مخصوص ذہنی عکس کو شعور میں لاتے ہیں۔

ان صفات کے بعد ارسطو عقل کو آگے لاتا ہے۔ جو حیوانوں اور انسان میں بنیادی طور پر امتیاز کر دیتی ہے۔ ارسطو نے عقل کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

ایک عقل انفعال یعنی تفکّر کرنے کی وہ ذہنی استعداد ہے جس سے علم حاصل ہوتا ہے۔ تفکر سے قبل تفکر کرنے کی جو ''قابلیت بالقوۃ'' ذہن میں موجود ہوتی ہے، اس کو ارسطو عقل انفعال کہتا ہے۔

دوسرے عقل فعال جو خود تفکر کا عمل ہے، جو کرہ ارض پر صرف انسان کو حاصل ہے۔ اس کی وجہ سے وہ دوسری تمام مخلوقات سے ممتاز اور متمیّز مخلوق کہلاتا ہے۔ ارسطو اسے یہاں (ارض) پر عاقل حیوان ہونے کی جہت سے ارتقاء کی آخری کڑی سمجھتا ہے۔

ارتقاء کی تحقیق کی ابتداء ڈارون (1809۔1882ء) نے کی۔ اس نے دیکھا کہ کائنات میں طبیعی قانون کے مطابق قدرتی انتخاب Natural Selection کا طریق چلا آرہا ہے یعنی جس نوع نے اپنے اندر آگے بڑھنے کے لئے قانونِ ارتقاء کے مطابق طبیعی قوّت وصلاحیّت حاصل کر لی، وہ آگے بڑھتی چلی گئی۔ تحقیق سے پتا چلا کہ جس نوع نے اپنے اندر اگلے مرحلے میں زندہ رہنے اور اگلے مرحلے کے موانعات کو مغلوب کرنے کی صلاحیت حاصل کر لی، وہ اگلے مراحل کی طرف بڑھ گئی۔ جو نوع اپنے مرحلے کے موانعات کو مغلوب کرنے کی صلاحیت تو حاصل کر لیتیں، لیکن اگلے مرحلے کے موانعات کو مغلوب کرنے کی صلاحیت حاصل نہ کر سکتیں، وہ اُسی مرحلے کی نوع بن کر رہ گئی۔ جو نوع اپنے مرحلے کے موانعات (تخریبی قوتوں) کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت بھی حاصل نہ کر سکیں، وہ ناپید ہو جاتیں۔

کائنات میں نظریہ ارتقاء کا جائزہ لیا جائے تو یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ اس ارتقاء کے عمل سے گزر کر ہی ہر شے اور انسانیت نشوونما پاتے ہوئے بقاء اور مزید آگے بڑھنے کی صلاحیت حاصل کرنے کی اُمیدوار بنتی ہے۔

حکمائے مغرب کائنات میں بتدریج ارتقاء کے مشاہدہ میں اس کو بلندی کی آخری سطح یز دانیّت تک پہنچا دیتے ہیں۔

ڈارون یہ نہ بتا سکا، اور کوئی نہیں بتا سکتا کہ پہلے مادی جرثومہ حیات، First Life Cell جسے قرآن نفس واحدہ کہتا ہے، میں زندگی کیسے آموجود ہوئی۔ تمام زندگیوں کی داستان حق و باطل کی کشمکش کی داستان ہے یعنی تخریبی اور تعمیری قوتوں کے ٹکراؤ کی داستان ہے۔ جسے قرآن حق کہتا ہے ڈارون اسے تعمیری قوت کہتا ہے، جو ٹکراؤ میں غالب آتی ہے، اور جسے قرآن باطل کہتا ہے وہ اسے تخریبی قوت کہتا ہے، جو ٹکراؤ میں مغلوب ہو جاتی ہے۔

ارتقاء کے جدید نظریات میں ہیگل اور برگسان کے درجِ ذیل نظریات کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ (جاری ہے)

Manzil ba Manzil (منزل بہ منزل)

Episode No: 2

Chapter 7: Present Hell

(*Qiyamat-e- Maujood* قیامت موجود) To Quran lovers

By G. A. Parwez (Translated by: M. Alam)

(Tulu-e-Islam Convention, April, 1963)

From the statements of the Bible of Barnabas you can also see that religious priesthood likes a style of government what is now called secular, i.e., political power remains with government while the power of personal laws and its enforcement is given to religious priesthood. And each one doesn't interfere in the affairs of the other.

Prophet Muhammad (PBUH)

In the end let us take the messenger of the final heavenly revelation and the most revered Prophet (PBUH). The very purpose of his message is mentioned as: وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ (7:157) – He will lift the burdens under which the humanity groans and free them from the shackles which bind them. To achieve this purpose Prophet Muhammad (PBUH) presented the same message that was presented by Noah (PBUH) and all of the continuous chain of Prophets down to Jesus (PBUH). And the response from the well-to-do section of the community (مترفین - *Mutrafeen*) to each and every messenger was also the same: مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِي الْمِلَّةِ الْاٰخِرَةِ ۚ اِنْ هٰذَآ اِلَّا اخْتِلَاقٌ ۚ (38:7) – They say what he presents has never before been heard from any of our forefathers. Obviously this is an absolutely new thing which he himself has devised. Therefore, it is false. That is, the only proof acceptable to them is that: None of our forefathers have said this! And history and the Quran are witness to what they (مترفین - *Mutrafeen*) did to the Prophet (PBUH) and his companions?

After the messenger

What used to happen after the messengers? Why was it necessary to send a follow-up messenger usually to same people when a messenger had already come to them and given the true دین (*Deen*) of Allah? Why was it that the new messenger couldn't find any trace of the original message of the previous messenger? Why was the new messenger against their prevalent customs and the rituals and ideologies and declared them to be false? And why did these people then oppose the new messenger and became his worst enemy?

Well, what used to happen was that when the previous messenger left, then after sometime, some serving-serving individuals used to change the original the original دین (*Deen*) of Allah given by the previous messenger into religion by incorporating their own thoughts and ideas. But they never used to tell

people that these are our thoughts and ideas. They used to tell people that their concocted religion was the true teaching of Allah. The Quran tells as to why they did this: فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ۗ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ (2:79) – Woe, then, unto those who write down, with their own hands, [something which they claim to be] divine writ, and then say. "This is from God," in order to acquire a trifling gain thereby; woe, then, unto them for what their hands have written, and woe unto them for all that they may have gained![Asad].

These people practice deception not only on others but also amongst themselves. The illiterate ones amongst them do not know what Allah has revealed and refer their questions about the Sharia to their religious leaders. The latter frame the Laws of the Sharia themselves but tell the former that these Laws are Divine. Thus they deceive others just to secure a paltry price for it, not realizing that their fabrication of the Sharia and their use of it as means of livelihood will bring about their ruin.

Religion versus دین (*Deen*)

It is strange that it wasn't the case – that when دین (*Deen*) was thus changed into religion – then religion became some sort of diluted version of the دین (*Deen*); or that there were some minor changes in the details of دین (*Deen*) and that became religion? No, it wasn't the case like this at all. What happened was that religion and دین (*Deen*) became against each other; that religion, in fact, turned into exact opposite of دین (*Deen*). Those who have done a comparative study of religion know this fact. Here is why?

- Religion is merely some sort of subjective experience and is concerned only with the so-called private relationship between God and man. Whereas دین (*Deen*) is an objective reality and a system of collective life.
- Every follower of a religion is satisfied that he has established a communion with the Almighty, and the objective of each individual is his own salvation. The aim of دین (*Deen*) on the other hand is the welfare and progress of all humankind, and the character and constitution of a society indicates whether or not it is founded upon the Divine Laws.
- Religion does not afford us any objective criterion by which we could determine whether or not our actions are producing the desired results. In a social order governed by دین (*Deen*, the development of a collective and harmonious life correctly indicates whether or not the people are pursuing the right course.
- Religion is hostile to scientific investigation and is an adversary of reason, so that it could flourish unhampered with the aid of a blind faith.

دین (*Deen*), on the other hand, helps in the development of human reason and knowledge; allows full freedom to accept or reject anything on the basis of reason and arguments. It encourages investigation and discovery of natural phenomena to illumine the path of human life and its advancement in the light of the Permanent Values.

- Religion follows the susceptibilities and prejudices of human beings and pampers them. دین (*Deen*) seeks to lead humankind to a path of life that is in harmony with the realities of life.
- In every age, therefore, religion sets up new idols and mumbo-jumbos in order to keep the people's attention away from the real problems of life. But دین (*Deen*) is rational and radical: it breaks all idols, old and new, and is never variable in its principles.
- Religion induces a perpetual sense of fear in the minds of human beings and seeks to frighten them into conformity while دین (*Deen*) treats fear as a form of polytheism and seeks to make human beings courageous, daring and self-reliant.
- Religion prompts human beings to bow down before every seat of authority and prestige, religious as well as temporal. دین (*Deen*) encourages human being to walk about with his head erect, and attain self-confidence.
- Religion induces human beings to flee from struggle of life. But دین (*Deen*) calls upon them to face the realities of life squarely, whatever the hazards.
- Religion treats the world of matter with contempt and calls upon human beings to renounce it. It promises paradise only in the Hereafter as a reward for the renunciation of the material world. دین (*Deen*), on the other hand, enjoins the conquest of matter and leads human beings to immeasurable heights of attainment. It exhorts human beings to seek well-being and happiness in this world as well as felicity in the life hereafter.
- Religion encourages belief in fatalism, and this tends to dissuade human beings from active life and self-development. دین (*Deen*) gives humans power to challenge fate, and provides energy for a life of activity and self-development.
- Religion seeks to comfort the weak, the helpless and the oppressed with the belief that the affairs of this world are governed by the Will of God and that its acceptance and resignation helps to endear them to God. This sort of teaching naturally leads to morbidity, and emboldens religious leaders who profess to interpret the Will of God, to continue to indulge in their misdeeds with perfect impunity and persuade the

adherents to a complete and quiet submission. دین (*Deen*), on the other hand, raises the banner of revolt against all forms of tyranny and exploitation. It calls upon the weak and the oppressed to follow the Divine Laws and thereby seek to establish a social order in which all tyrants and oppressors will be forced to accept the dictates of right and justice. In this social order, there is no place for dictators, capitalists or priests. They are all enemies of دین (*Deen*).

- Religion enjoins religious meditation in the name of worship and thus induces self-deception. دین (*Deen*) exhorts human beings to assert themselves and struggle perpetually for the establishment of the Divine Social Order, and its betterment when attained. Worship in دین (*Deen*) really means obedience to the Laws of God.
- Religion frowns and sneers at all things of art and beauty. دین (*Deen*) defies those who forbid the enjoyment of the good and beautiful things of life which God has created for the enjoyment of man.
- Religion denounces everything new and declares all innovation as sin. دین (*Deen*) holds that the needs and demands of human life keep changing with the change in the conditions of life; change and innovation are, therefore, demanded by life itself. Only the Divine Laws are immutable.

It should now be easy for us to see the fundamental difference between دین (*Deen*) and religion. It is religion, my dear friends, which poses as savior of humankind but, in fact, strangles it and kills its humanity.

Since falsehood does not have any leg to stand on, it always presents itself in front people wearing the hijab of truth. Religion does the same thing. It keeps the words, the terms, the rituals, the customs of دین (*Deen*) but takes away the spirits behind them. It is these outer shells of دین (*Deen*) by which religion deceives people. Religion, in fact, is the name of mummified corpse of دین (*Deen*).

***

The same thing happened to Islam

Whatever happened to دین (*Deen*) at the hands of previous peoples, my friends, the same thing happened to Islam as well. Allah completed the دین (*Deen*) and protected it in the Quran. And the Prophet (PBUH) gave this Quran in the form of a book to the Ummah. Shortly after the Prophet (PBUH) some self-serving powers raised their ugly heads. In this case, *Mulukiyyah* – the autocratic dynastic rule – came first, and then Capitalism. And, these two evil forces – in order to protect themselves – started changing دین (*Deen*) into religion. Therefore, this دین (*Deen*) also slowly changed into religion as had happened with the past messengers' دین (*Deen*) with one difference: this time the code of life of this دین (*Deen*) – the Quran – remained protected intact in its original

from because Allah Himself took the responsibility of its protection. But the protection of this Book became a constant prickly thorn in the eyes of religion. Therefore, religion did all its best to make the Quran ineffective in the life of people and it didn't leave any stone unturned to make sure that the Quran never becomes a practical code of conduct in the collective live of the Ummah. After the Prophet Muhammad (PBUH) no other Prophet will come now to fix things up and present the true دین (*Deen*) of Allah to the world. But there is no need for this as the دین (*Deen*) is completely protected and recorded word for word in the Quran. Therefore, in order to present the دین (*Deen*) now, there is only one way and that is to *try* to practically implement the Quran as a code of life in a piece of land.

Pakistan movement

And it was for this practical implementation of the Quran as a code of life that became the focal point for the demand for a separate piece of land for Muslims. *This* was the effort that came in front of us in our period in the form of the Pakistan movement. As you know the concept of Pakistan movement owes its origin to the Quranic understanding and knowledge of Allama Iqbal. This was the basis of his demand for a separate state for Muslims. He said that the Quran can become code of practical life for Muslims only when they have their own independent state where Quranic principles could be implemented. Religion is possible in any state governed by others but not the دین (*Deen*). You already know that the maximum opposition for the creation of Pakistan came from the Muslim religious establishment. This in fact is the same old perpetual struggle between دین (*Deen*) and religion that has existed since time immemorial. This point must be understood very clearly.

Opposition to Pakistan movement

My dear friends, the first priority of the religious establishment is to acquire all the powers of a state and make the government serve as a machinery for enforcing its decisions. This form if government is called theocracy. But if this is not possible then the effort of the religious establishment is to have a system in the state where political power remains with the political leaders and religious power remains with the religious leaders. This form of government is called secular style of government. After the first period of Islam – when دین (*Deen*) was changed into religion – this was the form that became of Muslim governments. This was the style of government that the British kept in India during their rule – public laws remained with the government while the personal laws were put under the jurisdiction of the religious establishment. The goal of the Pakistan movement was that the دین (*Deen*) be established there. It is obvious that there was no place of religion in this – and there was no place of secularism and capitalism in it. On the other hand, Hindus assured that

after the British left India, it will continue to remain secular. Since this suited the religious establishment, it compromised with the Hindus. Well, religion can compromise with anyone and everyone. But دین (*Deen*) cannot compromise with anyone – it is compromise-less (لا شریک).

Intellect is cunning; it can acquire a hundred faces;
Poor truth is neither Mullah, nor pious, nor astute!

So, the Pakistan movement which arose on the foundation of دین (*Deen*) could not obviously compromise with the Muslim religious establishment or with the Hindus. When the Pakistan movement didn't compromise with the religious leaders then they became its staunchest enemies. The leaders of this establishment were called the nationalist *Ulema* (علماء). Apart from them there was another small group at the time that was against the Pakistan movement but it was also against the nationalist *Ulema* (علماء). This group wanted all powers in its own hands, i.e., this group wanted to establish theocracy. Since دین (*Deen*) is as much against theocracy as it is against secularism, therefore Pakistan movement could not compromise with this group either. This group was known as *Jamat-e-Islami* (Islamic party).

Did you notice my friends how Pakistan struggle was the same perpetual struggle between دین (*Deen*) and religion that has always existed since the beginning of time?

After the creation of Pakistan

Despite strong opposition from religious groups Pakistan did come into existence. The irony is that these groups with their flood of armies also came to Pakistan. And the same struggle between religion and دین (*Deen*) has been going on over here since then; and their ultimate effort is that the rule of Quran never gets established here. Instead, they want first of all that theocracy gets established here; or if that is not possible then their effort is that government remains secular here so that public laws remains with government and the personal laws remains under their control. Because western style secular groups are also happy with this arrangement they don't hesitate to compromise with the religious establishment on this issue. So, the chances of secular style government are much more here. Proponents of theocracy also compromise on this issue and are happy with this arrangement although their ultimate goal remains the establishment of theocratic style government.

Constitutional making

These people have continued this effort in constitutional making. The first constitutional assembly recommended that the ultimate authority of constitution making be referred to a board of *Ulema* (علماء). This was a form of theocracy and these *Ulema* (علماء) were very happy with this. But when that

constitutional assembly got dissolved then these people switched their gear and opted for secular style government. Therefore these people profusely celebrated the 1956 constitution that was reflection of secular style of government in which private laws were recognized as separate from public laws and all the religious sects were given constitutional recognition. The 1962 constitution is better in that it does not separate between private and public laws and does not give official recognition to the existence of religious sects. This is the reason these people are so much against the 1962 constitution and are demanding that the "Islamic" part of the 1956 constitution be included in this constitution.

Opposition to the family laws

Have you ever noticed my friends why these people are making so much noise only against the family laws and leaving aside all other laws of the nation among which many are clearly against the Quran? For example, adultery is legal; red district areas are common in every city; fornication is not forbidden legally. Have you seen these people ever making hue and cry against these laws or calling for their abrogation? Why is it that these people don't collectively demonstrate against these laws? But they are united in creating so much uproar and hell against these family laws? The reason is obvious. These family laws were personal laws that continually have been in their control. This is the first time after the first-period of Islam that these so-called personal laws have been taken out from the jurisdiction of religious priesthood and put under the control of the government. Religious priesthood considers this interference in its jurisdictional affairs. So, how can it tolerate this? How can it let go of its power over these laws? That is the reason religious leaders have created a joint all-out opposition against these laws. Otherwise, there is nothing in these family laws that is against Islam.

Your responsibility

In all of these struggles the call for pure دین (*Deen*) is coming *only* from you, my dear friends. Therefore, you have become *the* target of religious priesthood. How fortunate are those who – in this struggle of دین (*Deen*) versus religion stand on the side of the دین (*Deen*) – on the side of messengers and their companions which Allah has termed as His party, حزب اللہ, (*Hizbullah* or the party of Allah).

Means and resources

Since religion can compromise with any institution or system or with any ideology – and it has the full backing of capitalists – religious priesthood has no shortage of means or lack of financial resources. Therefore, these people are able to control the propaganda machinery and are able to present falsehood as truth. Because دین (*Deen*) cannot compromise with anyone, the people who

stand up for دین (*Deen*) don't have any of these.

And since religion thinks it is right to use any trick to achieve its goals, it does not hesitate to lie for its ends. In the words of St. Paul, it proudly proclaims:

But if through my lie the truth of God abounded to His glory, why am I also still being judged as a sinner? [Romans 3:7]

Religion openly and arrogantly says:

Truth and justice are among the important principles of Islam. And falsehood is worst sin in its eyes. But certain necessities of practical life are such that it is not only allowed to lie but it becomes incumbent as a fatwa to lie in those situations. [Abul Ala Maududi, *Tarjumanul Quran*, May 1959]

Religion teaches that present yourself as righteous and proclaim sacred principles initially to gain popularity in the world. But when you have achieved popular support and power then leave aside those principles and only do what is in your best interests in practical life. [*Tarjumanul Quran* May 1958]. And if you have to use bribery to achieve your goal then think of it as righteous deed and don't call it bribery but call it as "winning heart". [Abul Ala Maududi's advice to Hakim Abdul Rahim Ashraf, *Al-Mimber*, 19 September, 1958]

Domination of دین (*Deen*)

Religion has been doing this kind of double dealing and deception from the very beginning. But this does not mean that religion can defeat دین (*Deen*) using such deceptive techniques. دین (*Deen*) is based on Allah's universal permanent laws; and these laws are bound to ultimately prevail. This is Allah's program and no power in the world can stop this program from reaching its end. But, as you know, truth overpowers falsehood slowly. This is because Allah's one day is 1000 years or even up to 50,000 years of human days. Thinkers and visionaries who have their eyes set on the revolutionary changes taking place in every corner of the world today – and which Allama Iqbal has called "existing hell" – know that the time is fast approaching (according to Nature's program) for the demise of all the life-systems that are based on false foundation. Kingship is coming to an end. With every morning's Sun, some "crown" gets thrown out. Capitalism, landlordism, Imperialism, etc. are being erased from the world like wrong words.

The fate of religion

And along with these the magic of religion is also evaporating like water particles. The strong grip that religion had on the hearts and minds only fifty years ago is loosening now: Sanaatan religion is vanishing very fast from India. Buddhism has been driven out from China. Tibet has lost its Buddhist gods (Lamas) and have become refugees in different parts of the world. Judaism has turned into Zionism and into political force. The power of

Christianity was the rule of the Pope, but it has now been relegated to within the walls of the Church; and is continually beset by scandals and corruption. That is, religion is under attack from all sides now:

An earthquake has occurred in the foundation of religion;
Its custodians are sitting and plotting new survival plans!

So, if this is the condition of religion all over the world, then do you think that *our* religion – mind you "religion" not the دین (*Deen*) – will stay? At this time, my friends, it is not the question of "this religion" or "that religion," but it is the question of "religion" itself whatever its name? To say that others' religion is false and so it will be destroyed, and our religion is true and therefore it will remain – is no more than self-deception? Custodians of every religion in the world say this. But religion never stands on truth. Only دین (*Deen*) stands on truth. The period of religion is ending now. Therefore, it will not remain despite all the efforts and intrigues and sacred wishes of its custodians. Allama Iqbal said this a long time ago:

The unlucky one has been on life-support for sometime;
I'm afraid that bad news may not come out of my tongue;
It seems its fate has been sealed and its end is in sight;
The priests are praying to drive away its final demise;
In the care of the West, maybe its life will get extended;
By the power of magic amulet given by the Devil Iblis!

This he wrote about the League of Nations. But it seems the same thing is happening to man-crafted religion as well. The emotional bursts that is coming out from the custodians of religion is like the cry of the animals before slaughter. This way they can create disturbance in the environment and chaos in the society but they cannot save their seats of power. The demands of the age will destroy them.

Destruction and then construction (لا و الا)

But, my dear friends, when falsehood is destroyed by the demands of the age then there remains one shortcoming in it. And that is, the demands of time can only destroy systems based on falsehood but, in its place, the system based on truth does not get established right afterward. There remains a vacuum between the two; and it takes a long time for the laws of Allah alone to establish the true system according to the cosmic speed. In the words of Allama Iqbal, the demands of time are like Allah's knifes that cut the veins to drain the dirty blood from the body of a bad system but they do not produce the good blood along with it. The good blood is produced by those who have passion in their hearts to establish the دین (*Deen*) of Allah. The period when the demands of time are destroying a false system is very conducive to them however, but it is full of difficulty and demands great fortitude and patience from them.

Working together: Some thoughts and reflections

Mansoor Alam

Here is a parable. The narrative seems all too familiar.

Once upon a time there was a community that lived in relative peace and tranquility. People worked together. They got along pretty well and trusted each other. More or less everyone in the community felt happy and contented. By and large corruption was missing from this community. So were such psychological ills as prejudice, ego, or envy among its people.

There was transparency and accountability in their decision making. Difference of opinion was not only tolerated but was considered an asset. People deeply respected each other no matter what their differences. They conducted their business in a civilized and peaceful manner. As a consequence, this community prospered and flourished like no other community around them… Then something happened.

Some 'holier-than-thou' individuals were not satisfied by the prevailing peace and tranquility in the community and the overall solidarity and openness in its ranks. They felt tradition and spirituality were missing from the picture. To them the community was too progressive, too liberal. These individuals felt obliged to do something about it.

They, therefore, eyed for the leadership of the community. First, these individuals brainwashed people into believing that they were the community's real well wishers. Promising to work for the welfare of the community and claiming to promote spiritualism these individuals were easily able to garner people's sympathy and support for their ulterior motives.

The situation started deteriorating though for the people when these few individuals started exerting their new leadership over the community. As it is usual, most people preferred to remain complacent and ignored the early warning signs. And by the time they did realize what had happened it was too late. The community as a whole felt powerless and weak, and divided.

In the mean time the neighboring community was carefully watching what was happening to this community. When the time was ripe they took over this community. Since it had become weak and divided it was an easy prey for its neighbor. Like opportunists waiting in the wings they grabbed the fruits of

other's labor. The Qur'an says this is the result of not being thankful to Allah for His blessings in the first place (16:112).

The above parable repeats time and again in real life. That is why the Qur'an narrates such parables for us as lessons in human discourse. Past history of various peoples are examples of this in one form or the other too numerous to mention. Sadly, Muslims have fallen into this category.

However, nothing could be gained by lamenting at this situation as we often do. Our usual emotional reaction does not help the situation either. On the other hand, maintaining status quo works in favor of the traditionalists (followers of forefathers according to the Qur'an) and against the common people.

So what to do? Whether we like it not, we are forced to interact with each other regardless of our views. Therefore, there is bound to be friction. However, pushing to the right or left as is normal in such cases, only cause further friction. How to strike a proper balance between these complex human interactions and maintain forward movement is the key for long term peace and stability.

However, it is not easy. People have been struggling with this issue throughout human history; because, when we work collectively we face problems that often frustrate us. Even if we agree on a common goal we often find it difficult to reconcile our differences in realizing that goal. Allah made us diverse for a reason: We have to *earn* our humanity.

How then can we work together towards this higher goal despite our pluralism? How should we value and weigh each other's opinions despite our diversity? How do we check our personal interests and ambitions from interfering with our collective interest? What factors hinder us from working together as a cohesive team?

These are complex questions and there are no simple answers. However, there is one factor that encompasses all these questions, and that is our ego. It feels very mysterious but its manifestations are very real. No one can deny that our ego comes into play consciously or subconsciously when we work together. We cannot avoid it or get rid of it no matter how much we may try. It is very easy for our ego to control us without our even being conscious of it. Moreover, we easily fall prey to our egos and, ironically, we tend to feel good about it. This is the real problem with the ego.

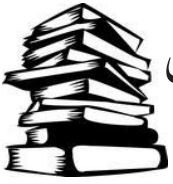
Nevertheless, we should note that nobility is rooted in humility. The Prophet (PBUH) was a very humble person. So, we must try to check our ego. But such is the grip of our ego on our hearts and minds that we often feel

helpless in subduing it. In any case, no matter how difficult it may be we have to wage this battle against our ego in order to humble it. That is why our Prophet (PBUH) termed this struggle as the higher jihad. This is *the* only way we would be able to get in touch with our true inner selves and be closer to Allah.

But there is something else. We must always remain on guard from the mischief of the whisperer who comes quietly and blows an air of suspicion into the hearts of people and withdraws (114: 4-5). The Qur'an – the final, the eternal, the complete, and the unchangeable Book of Allah – ends with these verses. That must tell us how important it is to be on guard from such whisperers.

That would enable us to harness the creative energy that flows within us for the higher good. Only then would we be able to make the best use of the synergy that comes into play when we work together in a spirit of cooperation based on mutual respect and trust. If that happens there is no way a community, a people, or a nation cannot but prosper materially *and* spiritually.

کراچی کے احباب کے لیے ضروری اطلاع



اب طلوع اسلام کی تمام بکس اور ''طلوع اسلام'' میگزین مندرجہ ذیل پتہ پر مل سکتا ہے



محمد اقبال

48 سی، 21 کمرشل اسٹریٹ، میزانین فلور، فیز 2، ایکسٹینشن
ڈی ایچ اے، کراچی رابطہ نمبر: 021-35395702, 0300-2275702

آصف جلیل

نالج اینڈ ویز ڈم سنٹر، سلمان ٹاورز، آفس نمبر A-45، بالمقابل نادرا آفس،
ملیر سٹی، کراچی رابطہ نمبر: 021-35421511,0333-2121992

محسوس سجدہ اس کے اس پرخلوص جذبہ کا بیساختہ مظہر نہیں اور محض (Form) ہی (Form) ہے' تو اس سجدے کے کوئی معنی نہیں۔ درحقیقت رکوع وسجود وعبادت کی روح انسان کے جذبہ فرماں پذیری اور اطاعت کے محسوس مظہر ہیں۔ اگر انسان خدا کی اطاعت تو نہ کرے اور صرف اس محسوس شکل کو مقصود بالذات سمجھ لے' تو نہ صرف خدا کی میزان میں اس کا کوئی وزن نہیں بلکہ قرآن کریم کے الفاظ میں انسان کے لئے تباہی کا موجب ہے۔ قرآن کریم میں ان محسوس ارکان (Form) کی تھوڑی سی شکل صلوٰۃ اور حج کی تقاریب میں باقی رکھی گئی ہیں اور وہ بھی انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی عمل ہیں۔ جن میں ضروری ہوتا ہے کہ ان کی محسوس شکل میں یک جہتی اور ہم شکلی ہو۔ یہ اجتماعی شکل نزول قرآن کے وقت میں' نبی اکرم ﷺ اور جماعت مومنین میں رائج تھی اور مساجد میں ادا کی جاتی تھی۔ جس طرح سجدہ سے مراد صرف سر کو زمین پر رکھنا نہیں بلکہ اس سے مفہوم قوانین خداوندی کے سامنے سر جھکا دینا بھی ہے' اسی طرح مسجد سے بھی بالخصوص وہ عمارت نہیں جس میں نماز ادا کی جاتی ہے۔ اس سے مراد وہ مقام ہے جو نبی اکرم ﷺ کے زمانہ میں لیا جاتا تھا جو اس نظام کا مرکز ہو جس کی رو سے قوانین خداوندی کی اطاعت کی یا کرائی جائے۔ اس میں اسلامی مملکت کے مختلف امور سرانجام دیئے جا سکتے ہیں۔ قرآن کریم کی رو سے ''عبادت'' کے معنی اطاعت کے ہیں اور دنیا کا کوئی کام جو قوانین خداوندی کے مطابق کیا جائے عبادت ہو جاتا ہے۔ اجتماع صلوٰۃ بھی چونکہ قانون خداوندی کی اطاعت ہے اس لئے وہ بھی عبادت ہے۔ ''عبادت'' کے لئے کسی ایسے الگ مکان کی ضرورت نہیں جس میں اور کچھ نہ کیا جا سکے۔

عبادت کا مفہوم سمجھنے کے لئے یہ ملحوظِ نگاہ رکھنا ضروری ہے کہ:

(1) قرآن میں جہاں اللہ کی عبادت کا ذکر ہوگا' اس کے معنی قوانین خداوندی کی برضا و رغبت اطاعت ہوں گے (1:5)۔

(2) قرآن میں جہاں طاغوت اور شیطان کی عبادت کا ذکر ہوگا' اس سے مفہوم یا تو انسانوں کے خود اپنے جذبات یا من دون اللہ' باطل پرست مذہبی پیشواؤں کی اطاعت ہوگی' اِن سے منع کیا گیا ہے (30:13, 19:44)۔

(3) قرآن میں جہاں بتوں یا دیوی دیوتاؤں کی عبادت کا ذکر ہوگا' وہاں مفہوم اِن کی تو ہم پرستانہ پرستش ہوگا (19:42)۔

(4) قرآن میں عبادُ الرَّحمٰن کے معنی ہیں وہ لوگ جو زندگی کی ہر سانس میں قوانین خداوندی کی اطاعت کریں (51:56)۔

☆☆☆

(اشاعت کے لئے محترم ڈاکٹر انعام الحق نے تعاون کیا ہے۔)

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

PUBLISHED SINCE 1938 AT THE BEHEST OF ALLAMA IQBAL[R] AND QUAID-E-AZAM[R]

CPL.NO. 28
VOL. 70
ISSUE
10

Monthly

TOLU-E-ISLAM

25-B, Gulberg 2, Lahore, Pakistan
Phone. 042-35714546, 042-35753666
E-mail:idarati@gmail.com
Web:www.toluislam.com www.facebook.com/talueislam/

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

خدائے رحمٰن ورحیم نے اس کتابِ عظیم کو اس لئے نازل کیا ہے کہ اُس نے، اشیائے کائنات اورنوعِ انسان کی نشوونما کی جو ذمہ داری لے رکھی ہے، وہ پوری ہوجائے۔(6:54؛6:12)

یہ نشوونما، وحی کی راہنمائی کے بغیر ممکن نہیں۔(17:82؛10:57۔58)

چونکہ انسانی دنیا میں خدا کی ذمہ داریاں انسانوں کے ہاتھوں پوری ہوتی ہیں، اس لئے خدا کے بندوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ جس کام کا بھی ارادہ کریں اُس سے مقصد، خدا کے اِس پروگرام کی تکمیل ہو۔(6:163)